لبِ گویا

-علی عبّاس امید-

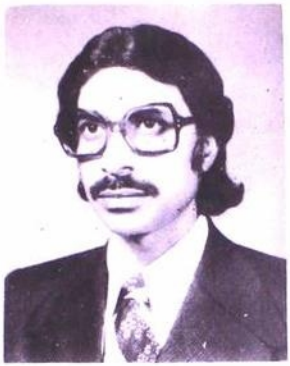

نام : سید علی عباس عابدی
پیدائش : تاجپور، یکم جولائی ۱۹۴۵ء
تعلیم : ایم۔اے۔ (معاشیات)
ملازمت : فی الوقت حکومت
مدھیہ پردیش
سے متعلق ۔

96/46, Tulsi Nagar,
BHOPAL-462 003.
INDIA

خواب خواب آرزو	۱۶۰	وہ کہہ رہے تھے کہ اب تو مجھے لگاؤ نہیں	۱۸۰
اب کے برس یہ کیا ہوا جذب و وصال ہے نیا	۱۶۲	رات ڈھلتی ہے تو پھر اس کو گنہگار کہو	۱۸۲
لہو ٹپک پڑے آنکھوں سے ایسی بات نہ ہو	۱۶۴	جون کا سورج	۱۸۴
لاحاصل لاحاصل	۱۶۶	تذکرہ ہے آرزوؤں کا نہ امیدوں کی بات	۱۸۶
پہنچے ہیں اس مقام پہ صحرا کہیں جسے	۱۶۸	اب تو جلتے ہوئے لمحات سے باتیں کرلیں	۱۸۸
تم کہ نادیدہ خواب میں گم ہو	۱۷۰	فرسٹریشن	۱۹۰
توازن	۱۷۲	میں نے جس کو چاہت کی نرم پھاؤں بخشی تھی	۱۹۲
مجھ سے اب پوچھتے ہیں شہر نگاراں کے مکیں	۱۷۴	نوکِ خار	۱۹۴
فصل گل میں بھی وہی دور خزاں ہے اب کے	۱۷۶	جنریشن کا دکھ	۱۹۵
موت	۱۷۸	علی عباس امید	۱۹۹

حصارِ سنگ ہے اس موڑ پر جہاں میں ہوں
بدن کو چھوتا ہے رہ رہ کے پرغبار دھواں

چمکتے برسوں کا عالم نہ پوچھئے امید
نظر نے دیکھ لیا ان کے آر پار دھواں

دائروں کا دکھ

شکستہ پر تھا
زمانہ نے یوں اسیر کیا
ہوا کا دوش بھی بھولا، گل اور گلشن بھی
دل و جگر ہی نہیں روح بھی شکستہ ہوئی
کھلی کتاب بنا پھر بھی پڑھ سکا نہ کوئی
نہ جانے کتنی ہی صدیاں گزر گئیں پل میں

اسیر وقت ہوں اب مجھ کو یاد ہے اتنا
کہ وقت آتا ہے لمحوں میں قید ہوتا ہے
اک ایک لمحے کی دہلیز پہ قدم رکھ کے
یہ پوچھتا ہوں کہ
وہ کون تھا جو مجھ میں مرا

پھر کوئی دست تہہ سنگ ہوا ہے شاید
سلسلہ اور بھی کچھ تنگ ہوا ہے شاید

صبح کے پاس ہے پژمردہ شگوفوں کا لباس
پیرہن شام کا بے رنگ ہوا ہے شاید

بج رہے ہیں مرے کانوں میں حقائق کے رباب
ارتقاء مجھ سے ہم آہنگ ہوا ہے شاید

آئینہ چور ہوا بچھ گئی ریزوں کی بساط
شیشہ گر خود بھی یہاں دنگ ہوا ہے شاید

میرے احساس کی وادی میں شگفتہ ہیں گلاب
واقعہ دل کا لہو رنگ ہوا ہے شاید

علی عباس امید

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

جاگتے خون کی بو آس کے صحرا میں نہیں
غم کا دامن کبھی بہت تنگ ہوا ہے شاید

سبز لمحات بھی اب سرخ ہوئے ہیں امید
اور کچھ باعث صد ننگ ہوا ہے شاید

لہو کی آواز

لوگ کہتے ہیں میں ایک دیوانہ ہوں
اپنے ہاتھوں میں سورج لئے
در بہ در
صبح تا شام
اور شام تا بہ سحر
ایک موہوم اور صرف موہوم امید پر
چل رہا ہوں ....مگر
ان کو اس کی نہیں ہے خبر
ناخدائی، خدا
بے وفائی، وفا
خودنمائی، حیا
خامشی، التجا
دست کش، نارسا
آرزو، حوصلہ

راہزن، قافلہ
ماضی و حال کا سلسلہ
وجہہ محرومی اور غدر کا معاملہ
سارے اسرار روشن ہیں کچھ اس طرح
جیسے پر نور سورج کی دلکش کرن

دونوں ہاتھوں میں کرنیں سمیٹے ہوئے

در بہ در
صبح تا شام
اور شام تا بہ سحر
(کو بہ کو، یم بہ یم
شاہ راہ شاہ رہ، انجمن انجمن)
پھر رہا ہوں بھٹکتا محض اس لئے
چار سو ہے اندھیروں کا سیلاب
اور
میرے چاروں طرف انگنت چہرے ہیں
خوف ہے نذر سیلاب یہ ہو نہ جائیں کہیں
اور اگر بچ بھی جائیں تو ان میں تصادم نہ ہو
تیرہ و تار راہیں من و تو کی ہیں
ان گھنی راہوں میں پھر کوئی گم نہ ہو

سانس لیتے ہوئے لفظوں میں سراپا لکھ دے
صفحۂ وقت پہ لکھنا ہے تو چہرہ لکھ دے

موسم ظلم بنایا ہے تو پھر دیر نہ کر
سبزہ و برگ کی قسمت میں بھی شعلہ لکھ دے

دور تک صفحۂ ہستی پہ بچھے ہیں پتھر
اب ضرورت ہے کہ ہر ہاتھ میں تیشہ لکھ دے

عارض درد کھلے، اشک تبسم بن جائیں
بھول کر بھی کبھی ایسا کوئی لمحہ لکھ دے

ریگزار غم ہستی کے ورق پر معبود
آدمی لکھ ہی چکا ساتھ میں تشنہ لکھ دے

آندھیاں ٹوٹیں حوادث کی ہر اک شب جن پر
التجا ہے کہ انھیں شاخوں میں پتہ لکھ دے

جس کا عنوان کتابوں میں بھی ڈھونڈے نہ ملے
میری تقدیر میں ایسا کوئی صفحہ لکھ دے

میری تحریروں نے لمحوں کو زباں بخشی ہے
شہر کے ہر در و دیوار پہ مژدہ لکھ دے

چشمِ امید سے ٹپکا ہے حقائق کا لہو
ہے تقاضا کہ اسی راہ میں سجدہ لکھ دے

رات تحریروں کی اب یکسر خیالی ہو گئی
لفظ جب جاگے عبارت بھی نرالی ہو گئی

انگنت چہرے تھے شہر دل میں لیکن کیا کہوں
وقت کا سایہ پڑا بستی یہ خالی ہو گئی

جن کا اک اک لفظ تھا مژدہ نئے موسم کے نام
حیف ان صفحات کی صورت بھی کالی ہو گئی

دل کے محبس سے چلے تھے قافلے یادوں کے پر
اک کرن پلکوں کی سولی پر سوالی ہو گئی

ہمسفر شائستگی تھی رہگزار زیست میں
پھر بھی جس سے بات کی ہر بات گالی ہو گئی

جس عہد میں ہم لوگ زندہ ہیں یا زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے پاس بنیادی الفاظ صرف دو ہیں۔ محرومی اور امید۔ علی عباس اپنا تخلص محروم رکھ لیتے تو میں ان کا کیا بگاڑ لیتا۔ میں خوش ہوں کہ انھوں نے اپنا تخلص امید رکھا۔

میں نے تخلص سے بات یوں شروع کی کہ میں تخلص کو عید پیچھے کی ٹر نہیں مانتا۔ جو شاعر تخلص نہیں رکھتے یا کوئی قلمی نام نہیں رکھتے وہ اپنے ناموں سے خوش یا مطمئن ہوں گے۔ شاعر کی شخصیت کا پہلا اظہار تو اس کے تخلص ہی سے ہوتا ہے۔ شاعر یہ بتلاتا ہے کہ اگر اسے خود اپنا نام رکھنا ہوتا تو وہ نام کیا ہوتا۔ اپنی زبان میں اسے کون سا لفظ سب سے زیادہ پسند ہے۔ تخلص خود شناسی کی طرف پہلا قدم ہے۔ شاعر شکاری نہیں ہوتا کہ گھر سے نکلا، ایک چڑیا مار لی اور اسے اپنی بندوق سے لٹکا کے گھر آگیا۔ تخلص اس کا لاشعوری یا تحت الشعوری یا بے شعوری کی کوئی حرکت نہیں۔ تخلص اس کی پہچان ہے۔ وہ چاہتا ہے اس لفظ کا چراغ جلا کر اس کے ذہن و دل کی کتاب پڑھی جائے اور اگر ہم اسی چراغ کی روشنی میں اس کے ذہن و دل کی وادی گردانی کریں تو اس کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید یہ بھی نہ ہوتا کہ تخلص رہ جائیں اور نام غائب ہو جائیں۔ قاری شاعر کو اس کی تخلص کی رسّی سے پکڑے رہتا ہے۔ میر، غالب، انیس وغیرہ کی باتیں کرتے وقت نہایت ہی تحقیق زدہ لوگوں کے سوا شاید ہی کوئی میر تقی میر، اسد اللہ خاں اور میر ببر علی علی عباس امید

حادثوں کی دھند سے فنکار نے جس کو گڑھا
شکر ہے اس بت کی پیشانی اجالی ہو گئی

کیسے اس موسم کو دوں گل کہوں امید میں
رنگ سے محروم جب اک ایک ڈالی ہو گئی

○

تاریخی لمحات

ماضی کے بوسیدہ مکان میں بیٹھنے والی
آنکھیں جب
ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح
تاریکی سے گزریں گی

ہم اور تم ـــــ تم اور ہم
ان سے دور چلیں گے

اور تب
چھوٹ جائیں گے ہاتھ
ٹوٹ جائیں گے رشتے
پھر ہم اور تم ـــــ تم اور ہم
ان آباد ویرانوں سے دور
کھائیوں، گہرائیوں میں

بھٹکتے بھٹکتے

یا تو نئے سورج کے ساتھ
دو الگ الگ افقوں پر اگیں گے

یا
ایک ڈوب جائے گا
دوسرا ابھر آئے گا

کچھ روز دکھیں گے بازو
قدم لڑکھڑائیں گے
بار بار دل کا ہر ازخم
بے رحم یادیں کھرچ جائیں گی
اور پھر ـــــ ہاں پھر وقت کے ساتھ
خون جم جائے گا
زخم بھر آئے گا
حوادث میں پلے ہوئے لمحات
تاریخی ہوں گے
فردا کی گراں باری سے آزاد
اپنے آپ میں مکمل

حال اور صرف حال کے آئینہ دار

○

شام کی جیب بھی خالی تھی سحر کی مانند
کس نے پھر رات سے خوابوں کے خزانے مانگے

علی عباس امید

اک شب رہِ حیات میں شمعیں جلا کے دیکھ
تو ظرفِ برق و باد کا یوں آزما کے دیکھ

تلخابۂ حیات تو پینا ہی ہے مگر
ہے لطف جب کہ پہلے اسے مسکرا کے دیکھ

ممکن ہے کوئی نکہتِ آوارہ ساتھ دے
کچھ رابطہ تو شہر سے اپنا بڑھا کے دیکھ

زنجیرِ پائے خواب میں تو نے پنھا تو دی
اب فرض ہے کہ حوصلہ نزدیک آ کے دیکھ

اک اک لکیر کا ابھی کھل جائے گا بھرم
چہرے کے نقش پر ذرا آنکھیں گڑا کے دیکھ

لبِ گور

کیسے ہوا کی زد پہ جلا ہے چراغ زلیست
سینے سے کوئی موج حوادث لگا کے دیکھ

صحرائے بے صدا ہے مرا جسم بھی امید
تجھ کو یقیں نہ آئے تو خود گنگنا کے دیکھ

○

ہر ایک سمت اندھیرا ہے کچھ کرو لوگو
تمہیں پکار رہا ہوں سنو سنو لوگو

سفید سایوں کے چہرے بھی بجھنے والے ہیں
مآل عہد وفا کچھ نہ کچھ تو ہو لوگو

اگر فضاؤں میں لکھنا ہو اپنا نام تمہیں
فصیل جسم کے باہر نکل چلو لوگو

بکھر چکی ہیں اندھیرے کی بتیاں ہر سو
اب اور دیر مناسب نہیں اٹھو لوگو

کھڑے ہیں کتنے ہی عفریت اپنے منہ کھولے
کبھی تو روح کے اندر بھی دیکھ لو لوگو

حصارِ سنگ میں ہے جشنِ بازدید ابھی
یہی تو وقت ہے کہ تیشہ زن بنو لوگو

یقیں کا درد چمکنے لگا ہے چہروں پر
لگے نہ ٹھیس کہیں اعتبار کو لوگو

قدم قدم پہ سرابوں کی شمع روشن ہے
جو پڑھ سکو تو کسی چہرے کو پڑھو لوگو

تمہارے ساتھ ہی چلتی ہے ساعتِ امید
کہیں ٹھہر کے تم آواز بھی تو دو لوگو

○

تخلیقی سفر کے پچیسویں پڑاؤ کی نظم

تا ابد بکھرے ہوئے صفحات کی واحد کتاب
واقعی ہے لاجواب

موسموں کی بھٹیوں میں
برف سے پُر وادیوں میں
کالی پیلی آندھیوں میں
آسماں کے نیچے ـــــ برگشتہ اجالوں
زرد گالوں
بکھرے بالوں
جھلسی کھالوں
والے سائے
خالی پیالوں کے سرہانے بیٹھ کر
اس صحیفہ میں گڑائے آنکھ

لب گو

غلطی ڈھونڈتے ہیں، صحیح کرتے ہیں

کئی دن بیت جاتے ہیں
کئی یگ بیت جاتے ہیں
تو یہ احساس ہوتا ہے
غلط نامہ جو وہ سائے
بہت محنت، بڑی ہی جاں فشانی سے
ہمارے واسطے (آئندہ نسلوں کی سہولت کو)
مرتب کر گئے تھے ـــــ اس میں خامی ہے
ہمیں بھی خالی پیالوں کے سرہانے بیٹھ کر
ان ہی کی طرح
آنکھوں کو گڑا کر
ہر سطر میں، ہر ورق پر
غلطیوں کو ٹھیک کرنا ہے
کئی دن بیت جائیں گے
کئی یگ بیت جائیں گے
یونہی یہ سلسلہ چلتا رہے گا
یہ صحیفہ
(تا ابد بکھرے ہوئے صفحات کی واحد کتاب)
واقعی ہے لاجواب
تا ابد ہر آنے والا

علی عباس امید

کو یاد کرتا ہو۔ مجروح، ساحر، میراجی، راشد۔۔۔۔ ان کے نام کون جانتا۔ اور ان کے نام جاننے کی کوشش کون کرتا ہے؟ یہ عمل تجارتی کے رویہ کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس سفر میں فلاں ابن فلاں کا زادِ راہ کام نہیں آتا۔

علی عباس نہایت ہی سخت "کھٹملانا" نام ہے۔ بالکل کربلائی۔ یعنی چٹکی بھر شہادت تو گھٹی میں ہے۔ اور تخلص رکھا ہے امیدؔ۔ یعنی اس لڑکے کو شہید ہونے سے کوئی روک ہی نہیں سکتا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ علی عباس "از قبیلۂ مانیست" کی لپیٹ میں نہیں آتے۔

زوار چچا یعنی علی عباس کے والد نے بھی اپنی عمر کا بیشتر حصہ غازی پور کے مسلم اینگلو ہائر سیکنڈری اسکول کی کربلا میں لمحہ لمحہ شہید ہوتے رہنے ہی میں گزارا ہے۔

گہنہ محمد آباد (اعظم گڈھ) کے کھرے سیدوں کا یہ خاندان بڑا سخت جان ہے۔ زوار چچا کے پاس ان دنوں ایک فاؤنٹین پن ہوا کرتا تھا، بلیک برڈ، (BLACK BIRD) مجھے یہ قلم بہت اچھا لگتا تھا کہ میں کیا بتاؤں۔ میں بہت للچایا کرتا تھا، عجیب اتفاق ہے کہ میرے ہاتھ میں اچھے سے اچھا قلم آیا پر کوئی بلیک برڈ نہیں آیا۔ اور اگر سنتیس اڑتیس سال کے بعد بھی مجھے یہ قلم یوں یاد ہے جیسے میں اسے کل ہی مل چکا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج میرے ہاتھ میں جو قلم ہے اس میں "زوار ماٹ صاحب" یعنی زوار چچا یعنی سید زوار حسن عابدی کے اس قلم کی ایک چٹکی ضرور ملی ہے۔

علی عباس تو اس قلم کے بیٹے ہیں، اس قلم نے نہ جانے کتنے لڑکوں کو حاضر یا غیر حاضر لکھا ہوگا۔ نہ جانے کتنے لڑکوں کو فیل یا پاس کیا ہوگا۔ اور نہ جانے کتنی بار اپنے گھر کا بجٹ لکھا ہوگا۔ اپنی آمدنی اور خرچ کے رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہوگی۔ اور رات کو سونے سے پہلے اپنے بچوں کے مستقبل کا خواب دیکھا ہوگا۔

اگر میرے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہوتی جس سے دلوں میں اترنا ممکن ہوتا تو میں زوار چچا کے دل میں اتر کر، ان کے پرانے خوابوں کے مسودے دیکھنے کے بعد یہ مقدمہ لکھنا شروع کرتا لیکن یہ ممکن نہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں علی عباس کو جانتا ہوں۔ سانولے رنگ کے اس بچے کو جانتا تھا جس نے کپڑے پہننا نہیں سیکھا تھا اور ننگ دھڑنگ فارغ البال علی عباس امیدؔ کو بھی جانتا ہوں۔

لب گویا

اس غلط نامہ کو اپنا ذہن، اپنی آنکھ دے گا
اور پھر احساس ہو گا
اس میں خامی ہے
ابھی کچھ اور خامی ہے

رنگ بے رنگ ہوئے دید کے معیار گرے
کھا کے ٹھوکر نہ کہیں گرمیٔ بازار گرے

آبلہ پائی بتا اب تو کدھر جائے گی
دھوپ کو ضد ہے کہ وہ بھی تہہ دیوار گرے

پیار کے نام پہ بستی میں صدا دی لیکن
سارے دروازوں سے کشکول میں انکار گرے

لڑکھڑایا تھا میں حالات کی ٹھوکر سے مگر
جانے کیا سوچ کے پہلے ہی مرے یار گرے

خوب ہے رت کا بدلنا مگر ایسا تو نہ ہو
شاخ کا پھول گرے، لفظ کی دستار گرے

علی عباس امید

سانس کے شانہ بہ شانہ جو چلی آتی تھی
ہائے کل رات اسی یاد کے آثار گرے

اجنبی اپنے ہی گھر میں نظر آتا ہوں امید
اب ضروری ہے کسی طرح یہ کردار گرے

○

تعلقات کی گرمی نہ اعتبار کی دھوپ
جھلس رہی ہے زمانے کو انتشار کی دھوپ

غمِ حیات کے سائے مہیب ہیں ورنہ
کسے پسند نہیں ہے خیالِ یار کی دھوپ

ابھی سے امن کی ٹھنڈک تلاش کرتے ہو
ابھی تو چمکی ہے یار و صلیب و دار کی دھوپ

الم کی راہ گزر پر بہت ہی کام آئیں
تمہاری یاد کی شمعیں، ہمارے پیار کی دھوپ

کمند ڈال دیں سورج پہ آؤ مل جل کر
اب اور تیز نہ ہونے دیں روزگار کی دھوپ

علی عباس امید

لبوں پہ مہر، جگر خوں چکاں، نظر حیراں
اب اور کیسے جلائے گی یہ بہار کی دھوپ

تمہارے شہر کی شیشہ بدست یادوں کو
تلاش کرتی رہی دل کے کوہسار کی دھوپ

بہت قریب ہیں سائے حیاتِ نو کے امید
بہت ہی جلد ڈھلے گی اب انتظار کی دھوپ

ناطقہ سر بہ گریباں ہے نہ جانے کیا ہو
ذہن کا شہر بھی ویراں ہے نہ جانے کیا ہو

عکس مٹے چھیڑ رہا ہے گل تنہائی کو
سرنگوں دیدۂ حیراں ہے نہ جانے کیا ہو

حکمراں ہے مرے ہونٹوں پہ طلسم خاموش
شبنمی آنکھ غزل خواں ہے نہ جانے کیا ہو

سوچتا ہے دل خوں گشتہ یہی رات ڈھلے
روح کا جسم بھی عریاں ہے نہ جانے کیا ہو

آمد بادِ صبا اور دریچوں کا سکوت
دم بہ خود شمع شبستاں ہے نہ جانے کیا ہو

علی عباس امید

نیند کے در پہ ملا تھا جو تجسس سے کبھ
آئینے میں وہی پنہاں ہے نہ جانے کیا

خواب نادیدہ چلے آتے ہیں چشم بیدا
پاؤں کی چاپ بھی رقصاں ہے نہ جانے کیا

کرنیں بجھتی ہی چلی جاتی ہیں قدموں کے تل
رہزن خواب پشیماں ہے نہ جانے کیا

میں ہوں امید وہی سادہ عبارت جس پ
لکھنے والا بھی پریشاں ہے نہ جانے کیا

ندی کا رجز

مجھے کناروں نے باندھنے کی
ہزار سازش،
ہزار سعی کی،
کنارے، جن کا بدن ہے سنگی
یہ چاہتے تھے کہ
زندگی میری اک دم سپاٹ گزرے
شباب میرا
لبوں کو سی لے
خموش ہو جائے پتھروں سا
مگر
یہ پابندیاں تھیں دشمن
نہ خوف کھایا
نہ ہار مانی

ایک سو چوبیس

زمیں سے الفت تھی مجھ کو ایسی
ہر ایک بندھن کو توڑ ڈالا
ہر ایک پتھر کو پھوڑ ڈالا
ہزاروں فصلوں کو زندگی دی
ہزاروں کھیتوں کو بڑھ کے چوما
کبھی میں گھومی ہوں جنگلوں میں
کبھی کتھی جا کے بستیوں میں
مرے جنوں کا ہے یہ کرشمہ
نئی نویلی ہر ایک کونپل
ادب سے
مجھ کو پکارتی ہے
نئے لقب سے
سنوارتی ہے

○

قضا کے ساتھ چلے زندگی کے بدلے میں
ملی نہ چھاؤں بھی اہلِ عمل کو رستے میں

جوابِ شہرِ خموشاں ہر ایک بستی ہے
گلاب کھلتے نہیں اب کسی دریچے میں

غمِ حیات کی پیغمبرانہ الفت کو
نہ جانے کب سے بسائے ہوئے ہیں سینے میں

پہنچ چکے ہیں یقیں کی حدود میں پھر بھی
لرز رہے ہیں قدم ساتھ ساتھ چلنے میں

شعورِ زیست کی الٹھ کرن نظر آئی
حیات نو کے سمٹتے ہوئے دھندلکے میں

علی عباس کی مسکراہٹ باہر کی طرف نکلتی ہوئی ہے جیسے وقت کی اداسی کو پکڑ کے اپنے رنگ میں نہلا دینا چاہتی ہو۔ علی عباس کے ہونٹوں اور آنکھوں کے درمیان سلسلۂ رسل و رسائل اچھا ہے۔ تار وقت پہ پہنچ جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسکراہٹ سے فوراً پہلے ہونٹ آنکھوں کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی مسکرانے لگتی ہے اور دیکھنے والوں کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آنکھیں پہلے مسکرائیں یا ہونٹ۔ یہ مسکراہٹ بڑی سادہ ہے لیکن اس کی شاعری میں مجھے یہ مسکراہٹ کہیں نہیں ملی اور میرا خیال ہے کہ یہ افسوس کی بات ہے۔

ہمارے ملک میں آٹے دال کی طرح مسکراہٹ کا بھی قحط ہے اور مسکراہٹ جو بازار میں بھی نہیں ملتی کہ پیسے دائے جائیں اور خرید لائیں اس لئے جو لوگ مسکرا سکتے ہیں انہیں مسکراتے رہنا چاہیئے اور علی عباس کے شعروں کو تو مسکرانا ہی چاہیئے کیونکہ وہ تو ۱۹۶۷ء میں یہ کہتے سنے گئے تھے کہ ؎

میری آنکھوں میں ہے شیشہ اور پتھر ہاتھ میں
یہ صدی میری ہے اور اس کا نمائندہ ہوں میں

میرے خیال میں یہ "آنکھوں کا شیشہ" آئینہ نہیں بلکہ شیشے کی آنکھ ہے جو نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی عکس قبول کر سکتی ہے۔ اتنا بے درد شعر کہنا آسان کام نہیں ہے اور آپ اس "واحد متکلم" سے بھی دھوکا نہ کھائیں۔ یہ آپ بیتی نہیں، جگ بیتی ہے۔ یہ اس عہد کے نوجوانوں کی بے جہتی کا اظہار ہے۔ اس جگہ سے "صلیب درد" تک آنے میں علی عباس کو تین سال لگے۔ کہتے ہیں۔

صلیب درد پہ ہر سانس گھٹنے والی ہے
کوئی نہیں رہا شاید اتارنے والا

۱۹۶۷ء اور ستر کے بیچ میں بڑی دلچسپ منزلیں آتی ہیں ؎

مجھ سے اب پوچھتی ہیں اس کی شگفتہ یادیں
تم نے پائی کوئی خوشبو مری خوشبو کی طرح

علی عباس امید

تمہارے قرب کی وہ ساعتِ حسیں اب بھی
رواں ہے ساتھ مرے یاد کے سفینے میں

ہر ایک سانس سوئے کہکشاں بڑھی لیکن
قدم بھٹکتے رہے عمر بھر اندھیرے میں

نکل کے محبس شب رنگ سے جنوں والے
اسیر ہوتے رہے عصرِ نو کے دھوکے میں

کرے جو عزم سفر اس کو یہ خبر کر دو
کہ اک پڑاؤ ہیں ہم اس طویل میلے میں

بہا جو صبح بہاراں کی جستجو میں امید
اسی لہو کا ہے پرتو ہر اک شگوفے میں

○

دوستو ایک نئے عہد کی میں ہوں تمہید
صفحۂ وقت پہ لکھ دو علی عباس امید

چشم آئینہ ہے آنکھوں میں یہ دشوار ہے دید
کیسے ڈھونڈوں تمہیں گم گشتہ عزیزان سدید

اپنا قاتل ہے یہ جلتے ہوئے لمحوں کا سکوت
کیوں نہ مل جل کے کریں درد بیاں کی تجدید

جیت ہی لیں گے بہر حال یہ ماحول کی جنگ
پست ہو جائیں گے اک روز مسائل کے یزید

نیک دل چہرو نہ گھبراؤ دعا ہے میری
راس آئے گا یقیناً تمہیں یہ دور جدید

علی عباس امید

میں گریزاں ہوں پگھلتے ہوئے لمحوں سے مگر
منجمد ذہن بھلا کیسے کریں گے تائید

تجھ پہ بازار میں گر سنگ ملامت آئیں
ظرف کو ہاتھ سے جانے نہ دے احساس خرید

میں رہوں یا نہ رہوں پھیلتا جائے ہر سمت
یہ مرا فن کہ مرے خونِ جگر کی ہے کشید

الجھی الجھی سی لکیروں میں گھرا ہے امید
ذہن کو کیجئے اک اور سفر کی تاکید

جہد رائیگاں

دردیدہ گوش کوئی، پنبہ دردہاں کوئی
اسیر کارگہہ طفل بوستاں کوئی
قتیل جبر کوئی، صید جسم وجاں کوئی
رموز درد میں الجھا دھواں دھواں کوئی
جسے بھی دیکھئے وہ گریہ در گلو ہے آج
نگار صفحۂ ہستی لہو لہو ہے آج

متاع زیست لئے حوصلے کے ہاتھوں پر
تجھے پکارتا ہوں رہزن شعاع سحر
یہ جسم وجاں ہیں ترے شرط صرف اتنی ہے
کہ اس کے بعد کوئی گریہ در گلو نہ ملے
نگار صفحۂ ہستی لہو لہو نہ ملے

یوں تو ہر اک لمحہ نیا حادثہ ہوا
لیکن نہ اپنے آپ سے میں آشنا ہوا

مجبوریاں عیوب کی فہرست دیکھ کر
کرتی ہیں اب سوال کہ کہئے یہ کیا ہوا

تاریکیوں کے دیس سے آیا تھا ایک چاند
گزری نہ پوری رات کہ ہم سے جدا ہوا

سورج نے چھپ کے سائے کی گردن مروڑ دی
میں پھر رہا ہوں چار طرف ڈھونڈتا ہوا

خیرہ دلوں کو کرتے ہیں چہروں کے آئینے
تنہائیوں کے گھر میں ہے میلہ لگا ہوا

لبِ گویا

پھرتا نہ جانے ڈھونڈتا کس کو کہاں کہاں
صد شکر دل ہے شام سے خود ہی بجھا ہوا

محرومیوں نے دی ہے مجھے یوں کتاب غم
جیسے کہ میرا نام ہو اس پر لکھا ہوا

پھیلی ہوئی تھی دھوپ بدن کی بدن پہ حیف
چونکا نہ پھر بھی رات کا مارا جگا ہوا

لمحوں کی بھاگ دوڑ میں امید روز و شب
ملتا ہے اک نیا ہی شگوفہ کھلا ہوا

شب سیہ میں تمنا کے خواب لایا ہوں
شعورِ فن کے لئے آفتاب لایا ہوں

اگے ہیں زیست کے صحرا میں ہر طرف کانٹے
لہو سے سینچ کے میں اک گلاب لایا ہوں

سجا کے آئینۂ دردِ لشتر جاں سے
حضورِ عشق نئی آب و تاب لایا ہوں

قدم بڑھائے نہ اب تیرگی صلیبوں کی
دیارِ غم سے کئی ماہتاب لایا ہوں

رہِ وفا میں حقائق کی جستجو کے لئے
متاعِ دل کی جگہ اک کتاب لایا ہوں

لبِ گویا

نہ جانے کب سے ستاروں کے زخم ہنستے ہیں
عروسِ شب کے لئے اضطراب لایا ہوں

نوائے درد، شکستِ وفا، فریبِ خواب
میں ان سوالوں کے سارے جواب لایا ہوں

قدم قدم پہ کھلے جو کنول شراروں کے
امید آج میں ان کا حساب لایا ہوں

عام سا حادثہ

سبزہ و برگ و غنچہ و گل سب
اٹ گئے تھے غبار صحرا سے
ایک دن سب نے یہ دعا مانگی
"خالق ارض! تیز بارش ہو
تاکہ گرد و غبار دُھل جائے
پھر بہاریں ہنسیں گلستاں میں
ہر روش پر نکھار آ جائے"

اور اسی شب دعا قبول ہوئی
آندھیوں کے رتھ پہ ابر سیہہ
مشعلیں برق کی، جلو میں گرج
لے کے آئے بہ اہتمام وہاں

دوسری صبح اک عجب منظر
ہر روش زیرِ آب، ہر غنچہ
چاک دامن، ملول و پژمردہ
پتہ پتہ پہ سوگ طاری تھا
زندگی ڈالیوں سے روٹھی تھی
نذرِ آتش ہوئے تھے کچھ پودے
کچھ کھڑے زندگی کو روتے تھے

بارہ

کاش کھل جائیں تمنا کے چمن
اور خوشی بادِ صبا بن کے چلے

جب کبھی ترکِ غمِ دل کا سوال آتا ہے
ریت پر نام تھا میرا بھی خیال آتا ہے

اب مرے خواب کے ہمراہ وہی یادیں ہیں
جن کو معلوم نہ تھا شیشے میں بال آتا ہے

دور تک شوخ خوشبوؤں کے پہاڑ
پھر بھی جنگل ہے کچھ اجاڑ اجاڑ

یہ جھلاہٹ یگانہ چنگیزی کی جھلاہٹ سے ملتی جلتی ہے لیکن علی عباس جانتے ہیں کہ بے شعور جھلاہٹ صرف تخریب کے کام آتی ہے۔ وہ تعمیر کے خواب نہیں دیکھ سکتی اور علی عباس امید اس کے قائل ہیں کہ ؎

میرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں

یہ "سلیقہ" بزدلی نہیں ہے۔ یہ "زندگی کرنے" سے آتا ہے۔
علی عباس صحرا کی طرف نکل تو گئے مگر گھر کی آوازیں پنڈ نہیں چھوڑتیں۔ ساتھ لگی ہوئی ہیں، آواز دیئے جا رہی ہیں ؎

رشتے ناتے کی زنجیریں توڑ کے گھر سے نکلا تھا
پھر بھی لگتا ہے جیسے دہلیز پکارے، آنگن ڈھونڈے

آئی ہے ایسی رات مگر کم بہت ہی کم
کرتے ہیں لوگ عزمِ سفر کم بہت ہی کم

ظلمت نصیب شہرِ تمنا میں دوستو
بجتا ہے حوصلوں کا گجر کم بہت ہی کم

سوتے ہو شامِ غم میں مگر یہ بھی سوچ لو
ہوتی ہے ایسی شب کی سحر کم بہت ہی کم

آئی ہے بوئے دوست مگر اتنی عرض ہے
پہلو میں گر ٹھہر تو ٹھہر کم بہت ہی کم

جب سے لیا پناہ غمِ دہر نے یہاں
آتے ہیں دل میں رشکِ قمر کم بہت ہی کم

اب گردشِ حیات بھی برگشتہ ہو گئی
ہوتا ہے التفات نظر کم بہت ہی کم

یوں تو قدم قدم پہ ہیں فنکار و فن پرست
لیکن ملیں گے اہلِ ہنر کم بہت ہی کم

مسکن کبھی امید کا یہ دل تھا لیکن اب
ہوتا ہے اس طرف سے گزر کم بہت ہی کم

○

زخمی لمحہ

رات نے اوڑھ لی پر کیف خیالوں کی ردا
خواب نادیدہ سمٹنے لگے پلکوں کے تلے
پھر کسی نے در امید پہ دستک دی ہے
کون ہو سکتا ہے اڑتی ہوئی خوشبو کے سوا

میں کہ جلتا ہوا لمحہ ہوں مرے پاس ابھی
ایک ایک یاد امانت ہے نگار دل کی
جسم کا لوچ، تر و تازہ گلابوں کی مہک
ابر مغرور، جنوں خیز ہواؤں کی سنک
پرفسوں بوسے، الجھتی ہوئی سانسوں کی کھنک
برف کی قاش سے اٹھتی ہوئی شعلے کی لپک
سطح احساس پہ یکبارگی بجلی کی چمک

روبہ رو صرف پگھلتے ہوئے سونے کی دمک
ہر خطِ جسم کے ہونٹوں پہ مچلتی باتیں
جانے انجانے گناہوں کی دھڑکتی راتیں
صفحۂ ذہن پہ اب بھی ہیں نمایاں ایسے
شیشۂ دل پہ منقش وہ سراپا جیسے
دے رہا ہے در امید پہ دستک کوئی
کون ہو سکتا ہے اڑتی ہوئی خوشبو کے سوا
خواب نادیدہ بکھرتے ہیں کلی کی مانند
مجھ کو اڑتی ہوئی خوشبو کی ضرورت کیا ہے
میں کہ جلتا ہوا لمحہ ہوں صدی کی مانند

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اب کدھر دیکھیں
نظر ملائیں اندھیروں سے یا سحر دیکھیں

بگولہ بن گیا میں آرزو میں وسعت کی
یہی تو وقت ہے کہ مجھ کو بے خبر دیکھیں

چلے جو سائے مرے ساتھ ریگزاروں سے
وہی بضد ہیں کہ بستی میں میرا گھر دیکھیں

چھپا ہے آگے سر آئینہ کوئی پیکر
ہمارے سامنے آئے۔ تو رات بھر دیکھیں

جو پھول ڈالتے ہیں مقبرہ پہ ماضی کے
کبھی تو چیر کے اس دور کا جگر دیکھیں

لب گویا

کبھی یہ سوچ لے تو بھی تو روٹھنے والے
چراغ گل ہوں تو پھر کیسے سنگ در دیکھیں

اتر کے آ چکا جب چاند میرے آنگن میں
فگار پاؤں چلے ہیں کہ رہ گزر دیکھیں

دھنک کے رنگ نے دیوار دوستی ڈھادی
نہیں ہے تاب کہ ہم یاس کا نگر دیکھیں

وہ چہرہ ایسا ہے جیسے چڑھا ہوا سورج
اسے خود دیکھیں تو امید دیدہ ور دیکھیں

بسترِ علالت سے ایک نظم

پیرہن دھند کا سورج کا مقدر ٹھہرا
پلکیں بوجھل ہوئی جاتی ہیں دریچوں کی امید
دن کی دہلیز پہ آپہنچے اندھیرے شاید
پھر نجھے جاتے ہیں دیواروں کے روشن چہرے

بند ماحول میں ٹھہرے ہیں گریزاں لمحے
تازگی ایک چھلاوے کی طرح آکے چلی جاتی ہے
جاگتی آنکھوں کو بے نور بنا جاتی ہے

دن کی دہلیز پہ آپہنچے اندھیرے شاید
پھر سزا جاگتے رہنے کی ملے گی مجھ کو
ذہن کے دشت میں ـــــ آوارہ خیالوں کے ہجوم

درد کے قافلے، بجھتے ہوئے خوابوں کے نجوم
یاس کے شانے پہ سر رکھے شکستہ احساس
ٹوٹے لفظوں میں الجھتی ہوئی آس
کوئی بھولا ہوا لمحہ، کوئی بسرا ہوا ساتھ
کوئی مانوس سی خوشبو، کوئی شفقت بھرا ہاتھ
ایک اک کر کے دبے پاؤں چلے آئیں گے

بجھ گئے ہیں درد دیوار کے روشن چہرے
ہو چکے اور بھی تنہائی کے سائے گہرے
درد کی کہر میں لپٹی ہوئی رات آ پہنچی

شب تو شب ہے یہ بہر حال گزر جائے گی
صبح کو آنا ہے، آئے گی، ضرور آئے گی
پھر بھی کچھ سوچ کے دل ہے کہ بجھا جاتا ہے
پلکیں بوجھل تھیں دریچوں کی وہ اب بند ہوئیں
ہاں مگر وا تھا درِ خواب سو وا ہے اب بھی

○

اس دور پُر غبار میں کیسی چلی ہوا
خوابوں سے بھی گزرتی نہیں شبنمی ہوا

گھیرے ہوئے ہیں مجھ کو حوادث کے خار و خس
ٹکرا رہی ہے جسم سے اک اجنبی ہوا

صحرا میں رقص کرتی تھی لیکن یہ دیکھئے
اس گھر میں پھر رہی ہے سسکتی ہوئی ہوا

بیدار کر گئی مرے خوابیدہ ذہن کو
گزری کبھی جو پاس سے خوشبو بھری ہوا

دستک کسی نے دل کے دریچوں پہ دی اگر
در آئی لڑکھڑاتی ہوئی سر پھری ہوا

لب گیا

کیوں کر زمیں کو چوم نہ لے بخل آرزو
جب مہرباں ہوں برق، شرر، تیرگی، ہوا

گرد و غبار دیکھ کے رہتا ہے کیوں خموش
آئینہ ساز دیکھ جو آئے کبھی ہوا

آئی تھی سیر گل کے لئے اس طرف مگر
ہر اک روش پہ چھوڑ گئی بے کلی ہوا

جز یاس کچھ بھی پاس نہیں تیرہ بخت کے
ورنہ بکھیرتی تھی کبھی نغمگی ہوا

امید سوچئے تو سہی یہ بھی درس ہے
ہر ایک شئے سے کرتی ہے کیوں دوستی ہوا

لیکن یہاں سے علی عباس امتید کی شاعری کا رنگ و روپ نکھرنے لگتا ہے۔
ان کی نظم "التجا" یوں شروع ہوتی ہے۔

اب نہ چہرے پہ اجالا
نہ گریباں میں سحر
آنکھیں خاموش
بتوں کی مانند
یا س بادل کی طرح چھائی ہوئی
راہیں گھبرائی ہوئی۔۔۔۔

اس نظم کی تعمیر میں ایک عجیب اہتمام ہے۔ فلم کے منظر نامہ کی طرح۔ کیمرہ مین (PAN) کرتا ہوا منظر دکھلاتا ہے اور تب ایک کردار پر ٹھہر جاتا ہے۔ راوی کی آواز فیڈ آؤٹ ہوتی ہے۔ کردار بولنے لگتا ہے۔

ایک اک آنکھ نے پڑھ لی
وہ عبارت یارو
جو مرے چہرے پہ قسام ازل نے لکھی
اس عبارت کا ہر اک لفظ بنا ہے کاسہ
میں سوالی نظر آنے لگا
سرتا بہ قدم

اس کے بعد پل بھر کا وقفہ ہے۔ جیسے وہ کردار اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہ تنہائی کو دیکھ رہا ہو اور پھر وہ ایک لمبا سانس لے کر بولنا شروع کرتا ہے۔

آنکھیں خاموش
بتوں کی مانند

ایک سو چھیالس

میں جستجو میں رہوں اور پھر نہ پاؤں اسے
مگر یہ ہو نہیں سکتا کہ بھول جاؤں اسے

وہ شعر کی طرح نازل ہو روح پر میری
میں نا امیدی کے لمحوں میں گنگناؤں اسے

یہ معجزہ مری چاہت کبھی تو دکھلائے
بھلانا چاہے مجھے اور یاد آؤں اسے

وہ شاخ گل کی طرح خوشبو میں لہراتی رہے
میں شوخ جھونکے کی مانند گدگداؤں اسے

تمام رات میں آنکھوں میں کاٹ دوں لیکن
نسیم صبح کو ہاتھوں میں لوں جگاؤں اسے

لب گویا

زمانہ شوق سے سنتا رہا مجھے امید
مگر میں سوچا کیا کاش کچھ سناؤں اسے

○

عروسِ وقت کی شوخی، حدیثِ جنسِ وفا
بہ نامِ زیست پھنسا ہوں میں کن بلاؤں میں
علی عباس امید

سنگِ سرد

دشتِ ویراں کی مانند ہیں میری آنکھیں
نہ کہیں سایۂ گل ہے نہ تمنا کی بہار
نہ تو جذبات کے غنچے نہ امیدوں کی پھوار
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا نشانِ کہسار
ایک ذرہ بھی نہیں یاں کا حسرت بہ کنار
عرش تا فرش فقط سوچ کی حسرت کا غبار
نہ کہیں نیند کا کاجل نہ کہیں شب کا خمار
اور بینائی بھی ٹھہری ہے متاعِ بے کار

بیکراں دشت کے ویرانے میں سطحِ احساس
ایسی اک جگہ ہے جس کے ہیں امیں ہوش و حواس
اور اس سطح پہ شفاف و بلوریں پیکر
شام کے ساتھ بہ اندازِ سحر

لیے گویا

اپنی رعنائی میگوں کے جلو میں ہر روز
چاند کی طرح سے ہوتا ہے طلوع
اس کی رعنائی مے گوں کی روپہلی کرنیں
دشت ویراں میں بکھر جاتی ہیں
اور کچھ اور نکھر آتی ہیں

چاند ویراں ہے مگر چاندنی کا روپ انوپ
اپنی باہنوں میں سمیٹے ہوئے ماحول کی دھوپ
بیکراں دشت میں جس سمت چلا جاتا ہے
اس کی ویرانی کو شاداب بنا آتا ہے

روح کی بات سنے، جسم کے تیور دیکھے
التجا ہے کہ وہ اس آگ میں جل کر دیکھے

تم وہ دریا کہ چڑھے بھی تو گھڑی بھر کے لئے
میں وہ قطرہ ہوں جو گر کے بھی سمندر دیکھے

چبھتا ماحول، گھٹی روح، گریزاں لمحے
دل کی حسرت ہے کبھی ان سے نکل کر دیکھے

ایک نقطے پہ زمانہ رہا ہنگام وصال
شیشۂ جسم میں سو طرح کے منظر دیکھے

کیسے کرلے وہ یقیں تجھ پہ فریب غم ذات
تیری راہوں میں جو تشکیک کے پتھر دیکھے

لب گویا

بات ہو صرف حقیقت کی تو سہہ لے لیکن
اپنے خوابوں کو بکھرتے کوئی کیوں کر دیکھے

اس خدوخال میں ڈھل کر ہوا کرنوں کا نزول
آج تو صبح نے بھی حسن کے پیکر دیکھے

نرم نازک سا وہ اک لمحہ جو میرا تھا کبھی
اس کے ہاتھوں میں بھی حالات کے خنجر دیکھے

ہم سے مت پوچھئے کیا نفس پہ گزری امید
ایک اک سانس سے لڑتے ہوئے لشکر دیکھے

○

ایک پرانی نظم

بہت سے جسموں سے میں گزر کر
پہنچ گیا ہوں اب اس صدی میں
چہار جانب کھڑا ہوا ہے
کروڑوں جسموں کا تیرہ جنگل
فسردہ چہروں کا تپتا سورج
اندھیرے جنگل پہ خندہ زن ہے!

بھٹک رہا ہوں اندھیرے جنگل میں
ہر قدم پہ
ہر اک سے میں پوچھتا ہوں
تھم کر
کہ جسم میرا کہاں چھپا ہے
کہاں وہ چہرہ ہے

لب گویا

جو کہ میرا ہے

صرف میرا!!

○

تنہائیوں کی شب کا وہ پھیلا ہوا جنگل
اور اس میں امیدوں کے دیئے حدِ نظر تک

علی عباس امید

ایک اور پرانی نظم

آنکھیں، کان، دہانہ، ناک
دکھ کے پھیلے، سمٹے، بکھرے نقوش
بیتے برسوں کا حاصل
پیشانی کی گہری لکیریں
میرا، اس کا، آپ کا چہرہ
سب کا چہرہ!

پھر اس چہرے میں میرا کیا ہے؟
اس کا کیا ہے؟
آپ کا کیا ہے؟

کون بتائے کس کا کیا ہے؟
یہ چہرہ اک آئینہ ہے

سب اپنا چہرہ دیکھ رہے ہیں !!

○

کل غم کے گھر میں دیکھ کے سایہ لرز گئے
یوں تو ڈرے نہ تھے کبھی تیغ رواں سے ہم

علی عباس امید

چاہتا ہوں کہ برس جائیں یہ آنکھیں
کھل کر
جسم تازہ ہو تو شاید ہو شگوفے کی نمو
جبر کی دھوپ میں بھی
ہنس پڑیں خوابوں کے کنول
میرے چہرے پہ جو لکھی ہے عبارت
اس کے
ایک ایک لفظ کے چہرے پہ اجالا ہو
گریباں میں سحر!

یہ مایوسی کی گرد ہے۔ دور تک امید کے کسی سورج کے طلوع ہونے کے آثار نہیں۔ اور تب اس آدمی میں جو تخلیقی فنکار ہے وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔

التجا کرتا ہوں
اس قادرِ مطلق کے حضور
گنبدِ شب میں مہ و نجم سجائے جس نے
شہرِ دل میں نہ سہی چاند ستارے لیکن
امن کی دیواروں کے حصے میں دریچہ دے دے
لالہ و گل کی ضرورت نہیں اس گلشن کو
ہو سکے گر تو کوئی پھول سا چہرہ دے دے
جسم بخشے ہیں تمناؤں کو جب پتھر کے
دستِ امید میں ساغر نہ دے
شیشہ دے دے!!

آج اس طرح اندھیروں کو سزا دی جائے
روشنی دل کی سرِ شام بجھا دی جائے

اس کے کوچہ میں پھریں وقفِ ملامت ہو کر
کیوں نہ کچھ عمر اسی طرح گنوا دی جائے

ایک بے نام تمنا سے چھڑا کر دامن
اب ارادہ ہے رہ و رسم بڑھا دی جائے

مجھ سے آگے مرا سایہ، مری رسوائی ہے
دل یہ کہتا ہے کبھی ان کو صدا دی جائے

اب تو خواہش ہے سرِ راہ کبھی چھو کے اسے
آگہی — سر پہ تیرے خاک اڑا دی جائے

ہم کو دلچسپی نہیں آئینہ خانوں میں مگر
آپ کہتے ہیں تو دیوار سجا دی جائے

خاک پر سو کے سوئے عرش اڑا کرتے ہیں
ایسے خوابوں کو حقیقت کی جلا دی جائے

بیکراں دشت میں بڑھتے رہیں، بڑھتے ہی رہیں
اور لمحوں کی یہ دیوار گرا دی جائے

پر فسوں خوشبو سے مسحور ہوں اب بھی امید
کیوں نہ اس جسم کی وادی کو دعا دی جائے

گیسوئے وقت بکھر جانے دو
درد کو حد سے گزر جانے دو

کب سے پلکوں کی زباں سوکھی ہے
اب تو پیمانوں کو بھر جانے دو

ٹوٹ جائے گا تغافل کا بھرم
سازِ امروز اتر جانے دو

زندگی، خواب، شکست احساس
اور الجھ جاؤں گا گھر جانے دو

جن کے دامن پہ لہو ہے اب تک
ایسے لمحات کو مر جانے دو

لبِ گویا

صبح کی آس تو بندھ سکتی ہے
زلف کو تا بہ کمر جانے دو

مجھ پہ امید کا الزام سہی
اب اسے یاس کے سر جانے دو

○

خواب خواب آرزو

فضا میں خامشی ہے
پوری بستی سو چکی ہے
دیئے یادوں کے مدّھم ہو چکے ہیں
جو گزرا ہے اسے یکسر بھلا کر
ہم آنے والے دن کو رو چکے ہیں
(بہت کچھ کھو چکے ہیں)

یہی جی چاہتا ہے اب
کہ اک گہرا سمندر نیند کا ہو
ہم اس کی تہہ میں
کچھ اس طرح ڈوبیں
کہ چاہیں بھی تو پھر باہر نہ نکلیں

اگر ڈھونڈیں ہمیں سورج کی کرنیں
تو ان کے ہاتھ بھی ہرگز نہ آئیں
ہماری طرح وہ بھی تھک کے آخر
اسی گہرے سمندر میں اتر جائیں
کچھ دیر سو جائیں

○

اب کے برس یہ کیا ہوا جذب وصال ہے نیا
دل کی حکایتیں نئی، میرا خیال ہے نیا

آرزوئیں ہیں تیز گام. لفظوں کا قحط ہر طرف
شورشِ جاں قدیم ہے پھر بھی ملال ہے نیا

ڈھونڈیئے ایک رابطہ خواب میں اور خیال میں
یہ تو نہ کہئے مہرباں میرا یہ حال ہے نیا

تیرے بدن کا راہرو میں ہوں اے رشکِ ماہ
فرصتِ نیم شب میں کیوں تیرا سوال ہے نیا

خشک ہے چشمۂ قلم بجھ گئی شمع فکر و فن
سنتا ہوں دشتِ ذہن پر اب کے زوال ہے

لبِ گ

کس کو بھلا یہ علم ہے رنگوں کا ایک طلسم ہے
یا کہ نگارِ وقت پر بکھرا اجمال ہے نیا

عرض نیاز عشق کی مجھ سے نہ پوچھئے امید
تیشۂ آگہی ہے کند، قصرِ وصال ہے نیا

○

لہو ٹپک پڑے آنکھوں سے ایسی بات نہ ہو
خدا کرے کبھی تجدید التفات نہ ہو

گزشتہ رات یہ تنہائی نے کہا مجھ سے
رہِ پہلی قاش کہیں نذرِ حادثات نہ ہو

نکل پڑا ہوں خود اپنے ہی دل کی بستی میں
مرے نصیب پہ بھی گیسوؤں کی رات نہ ہو

سمیٹ تو لوں وہ لمحے جو یادگار بنیں
مگر یہ ڈر ہے کہیں کوئی واردات نہ ہو

ترا خیال کہ گلگوں ہو آنکھ کا صحرا
مری یہ شرط کہ بے گانۂ حیات نہ ہو

لبِ گویا

حدودِ رنگ سے باہر نہ ذہن پہنچے کبھی
برہنہ جسم اگر نقشِ کائنات نہ ہو

کہانیوں کے شبستاں کی سیر خوب مگر
یہ خوف بھی ہے کہیں قیدِ خواہشات نہ ہو

فراقِ ضبط میں ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں
میانِ راہِ تاسف کی وہ برات نہ ہو

یہ نظم میں نے اس لئے آپ کو سنائی کہ اس نے اس عہد کے نوجوانوں کی پوری حقیقت کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اسے سماجی اور سیاسی ناانصافیوں کا احساس ہے مگر وہ ذہنی طور پر ان ناانصافیوں کے خلاف جہاد کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پاتا، شاید ڈرتا ہے۔ اسی لئے "قسام ازل" کو بیچ میں لاتا ہے۔ کیونکہ جہنم تو مرنے کے بعد کی بات ہے، ابھی اس کا ڈر نہیں، لیکن سرکاریں تو ابھی جیل میں بند کر سکتی ہیں۔ لاٹھی چارج کر سکتی ہیں، گولی مار سکتی ہیں، پولیس گھروں میں گھس کر عورتوں کی بے آبروئی کر سکتی ہے۔ سرکار اللہ سے زیادہ ڈرنے کی چیز ہے۔

نوجوانوں کا یہ رویہ دراصل استحصالی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے جو جماعت اسلامی کی داڑھی بڑھائے اور آر۔ ایس۔ ایس کی ٹوپی لگائے، مذہب کے نام پر انسان کو انسان سے الگ کرتی ہیں اور نتیجہ میں ان انسان دشمن طاقتوں کا ساتھ دیتی ہیں۔

ایک طرف یہ نوجوان ہے جو ہر چیز کے لئے قسام ازل کو ذمہ دار ٹھہرا کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ "جدید لوگ" ہیں جنہیں ان سماجی اور سیاسی ناانصافیوں کا ادراک ہی نہیں ہے۔ اور ان دو رویوں کے بیچ میں اس عہد کی پوری حقیقت ہے، تو کیا اس حقیقت کو کسی اور نسل کا انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ ان "قسام ازل" والوں کی طرف سے میں بالکل مایوس نہیں ہوں انھوں نے سوچنے کی طاقت کھوئی نہیں ہے۔ یہ سوالوں سے گھبراتے ہیں۔ سوال کرتے ہیں۔ علی عباس ہی کا ایک شعر سنئے ؎

سیاہ رات کے آنگن میں سوچتا ہوں میں
نکل کے شہر سے سورج کا کیا بنا ہوگا

یہ "سورج" وہ استعارہ ہے جسے ترقی پسندوں نے آزادی کے لئے استعمال کیا تھا۔ یہ "سیاہ رات" وہ استعارہ ہے جس سے "غلامی" کا اظہار کیا جاتا تھا اگر ان دونوں استعاروں کے تاریخی استعمال کو آگے بڑھا کر یہ شعر پڑھا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ شعر "شب گزیدہ سحر" سے آگے کی بات ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ہمیں آج بھی ان پرانے استعاروں کی ضرورت ہے اور یہ

لاحاصل، لاحاصل

سعیٔ لاحاصل سہی
کھلنے دے خوابوں کے کنول
(دائروں میں گھومنے والوں نے دیکھے ہیں
سرابوں کے کنول)

اونگھتے سورج کے
پیلے عکس نے
آنکھوں میں بھر دیں کرچیاں
سوزِ محرومی ہے شہہ رگ میں نہاں
(دن کے چہرے سے عیاں)

پیلے پیلے دائروں کی موج میں
کھلنے دے خوابوں کے کنول

تشنہ سرابوں کے کنول
سعیٔ لاحاصل سہی
اک سعیٔ لاحاصل سہی

○

حالات کو لے آئے ہمیں شہرِ سخن تک
حالات نے ہم پر ہی مگر سنگ اٹھائے

علی عباس امید

پہنچے ہیں اس مقام پہ صحرا کہیں جسے
پژمردہ ہے وہ پھول کہ چہرہ کہیں جسے

رسوائے شہر زخم تمنا کہیں جسے
ہونٹوں پہ ایسی موج ہے دریا کہیں جسے

حسرت ہے بھاگتے ہوئے لمحوں کے درمیاں
ایسی صدا بھی آئے کہ نغمہ کہیں جسے

مٹتی ہے اس کے ہاتھوں کی اب دیکھئے لکیر
جسموں کے آبشار پہ سایہ کہیں جسے

گزرا ہوں میں سوالوں کے جنگل سے بارہا
پھر بھی رہا ہوں ایسے کہ تنہا کہیں جسے

اڑتا ہو عکس شیشۂ دانش سے بھی پرے
ایسا نہ آدمی ہو فرشتہ کہیں جسے

جھونکے مری تلاش میں پھرتے ہیں چار سو
آنکھوں میں وہ پیام ہے مژدہ کہیں جسے

سانسوں کا عکس صفحۂ ہستی پہ ہے مگر
ایسی کہاں شبیہہ شگفتہ کہیں جسے

ہے تو کتاب زیست جلی پر ہمیں امید
پڑھنا ہے ہر وہ لفظ شکستہ کہیں جسے

○

علی عباس امید

تم کہ نادیدہ خواب میں گم ہو
کیسے کہہ دوں عذاب میں گم ہو

جو بھی آبِ رواں اسے سمجھے
درحقیقت سراب میں گم ہو

جس کا احساس کورا کاغذ ہے
کس طرح وہ کتاب میں گم ہو

آج رفتار کا تقاضا ہے
زین سے چل رکاب میں گم ہو

تلوے خون رنگ، ہاتھ میں کانٹے
اب بھی یادِ گلاب میں گم ہو

بے زباں تو نہیں ترا چہرہ
غیر ممکن نقاب میں گم ہو

پاؤں چھونے لگا ہے سیل رواں
بھاگ قصر حباب میں گم ہو

زندگی کٹ گئی عذابوں میں
پھر بھی فکر ثواب میں گم ہو

پہلے کالے سوال سن امید
پھر تو اجلے جواب میں گم ہو

○

توازن

زندگی ____
بیکراں سمندر ہے
جو کبھی پر سکون ہے،
ساکت ہے
اور کبھی
غیظ میں ہے دہشتناک
دوست کی طرح مہرباں ہے کبھی
اور کبھی بدترین دشمن جاں

سائنس ____
اک مختصر سفینہ ہے
جو کنارے کی آرزو لے کر
روز و شب بہہ رہا ہے موجوں پر
ماں کی مانند مہرباں لہریں

ایک سو تہتر

تھپکیاں دیتی ہیں کبھی اس کو
اور کبھی
تند، سنگ دل دھارے
چھوڑ آتے ہیں اس کو بیچ بھنور ؟

○

علی عباس امید

۳

مجھ سے اب پوچھتے ہیں شہر نگاراں کے مکیں
زندگی "زہر مجسم" تھی تو کس طرح جئے

۴

شامل رقص صبا اہل خرد ہو نہ سکے
یوں تو وحشت نے کئی بار بڑھاوے بھی دیئے

۷

دل شکستہ ہیں تمنائیں تو پژمردہ امید
موج مے بال کشا آئی ہے فریاد لئے

۱

آنے والا ہی نہیں جب کوئی پرسش کے لئے
جل اٹھے کیوں یہ سر شام ہی زخموں کے دیئے

۲

چند موہوم امیدیں تھیں سو وہ بھی نہ رہیں
اے خدا اور کہاں تک کوئی اب زہر پیئے

آج تک مسئلۂ تشنہ لبی حل نہ ہوا
مدتیں بیتی ہیں رندوں کو گرفتار کئے

۶

آدمی جادۂ منزل پہ بھٹکتا ہے ابھی
حال دل کون سنے، چاک جگر کون سیئے

○

جو سورج کی فکر ہے یہ بھی بڑی قابل قدر ہے۔ کیونکہ اسی فکر نے تو شاعر کے دل میں تھوڑی سی دھوپ اتار رکھی ہے ؎

پھر کسی نے در امید پہ دستک دی ہے
کون ہو سکتا ہے اڑتی ہوئی خوشبو کے سوا

(زخمی لمحہ)

کھڑکیاں ہی کھول لیں گر بند دروازہ رہے
آتے جاتے موسموں کا کچھ تو اندازہ رہے

کوئی سایہ بھی نہیں شہر وفا کے موڑ پر
کون دہرائے تمنا کے مہکتے واقعات

غم حیات کے سائے مہیب ہیں ورنہ
کسے پسند نہیں ہے خیال یار کی دھوپ

آنکھ میں گرد ہے یادوں کی
دھواں چھایا ہے
ہاتھ میں دامن حسرت ہے
دزدیدہ وہ بھی

(صلیب بردوش)

اتنے افسردہ نہ ہو دیوار و در میں کچھ تو ہے
دشت میں سبزہ نہ سہی ویران گھر میں کچھ تو ہے

لب گویا

فصلِ گل میں بھی وہی دورِ خزاں ہے اب کے
کیسا غم وقت کے چہرے سے عیاں ہے اب کے

مشعلیں ہیں، نہ دھواں ہے، نہ صدائے ناقوس
کیا خبر قافلۂ درد کہاں ہے اب کے

زندگی وقت کے در تک جسے لے آئی تھی
دھند لا دھند لا اسی انساں کا نشاں ہے اب کے

چارہ گر رحم نہ کر اس کی ضرورت کیا ہے
میرا ہر زخم مرے دل کی زباں ہے اب کے

لالہ زاروں سے تو گل رنگ پلٹ آئی تھی
دل کے ویرانے میں ہر سمت دھواں ہے اب کے

لبِ گویا

مجھ پہ وہ سانحہ گزرا ہے اسیرانِ قفس
اپنے سائے سے بھی وحشت کا گماں ہے اب کے

سر بہ زانو تھیں تمنائیں نہ جانے کب سے
چشمِ امید بھی خوں آبہ فشاں ہے اب کے

○

علی عباس امید

موت

سنہری کرنوں کے اس تاجدار
سورج نے
گجر بھی قافلۂ نیند کا نہ بجنے دیا
ابھی لگی ہی تھیں آنکھیں
کہ بند کمرے میں
در آئیں زہر میں ڈوبی
سیاہ دل کرنیں

ستم رسیدہ و مظلوم بجھتی آنکھوں نے
تڑپ کے دیکھا تو
ہر سمت
انگنت آنکھیں

انھیں کی طرح
تڑپتی ہوئی نظر آئیں

○

رات سپنوں کی بھیڑ لے آئی
دن اکیلا تھا ڈر گیا صاحب

علی عباس امید

وہ کہہ رہے تھے کہ اب تو مجھے لگاؤ نہیں
ہے بات اتنی کہ اگلا سا رکھ رکھاؤ نہیں

انا کے پاؤں سے کانٹے نکال لینے دے
پھر اس کے بعد کہوں گا کہ اب تناؤ نہیں

ترے شباب کی بستی اجڑ گئی شاید
بہت دنوں سے مری فکر میں رچاؤ نہیں

جو ہاتھ سینک رہا ہے اسے پتہ کیا ہے
کہ میرے خواب سلگتے ہیں یہ الاؤ نہیں

وہ اپنی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے
تم اپنی پلکوں پہ تعبیر کو سجاؤ نہیں

لب گویا

لہو سے کون لکھے گا حکایت امروز
مری طرح تو کسی اور دل میں گھاؤ نہیں

مرا قلم، مرا احساس، میری فکر امید
وہ کارواں ہے یہ جس کا کہیں پڑاؤ نہیں

○

علی عباس امید

رات ڈھلتی ہے تو پھر اس کو گنہگار کہو
دن نکل آئے تو سورج کو خطا کار کہو

وقت کے رتھ پہ رواں ساعت دیدار سہی
ہاتھ آئے تو اسے دولت بے کار کہو

زندگی ختم ہو لفظوں کے تعاقب میں مگر
لفظ مل جائیں تو پھر ان کو سردار کہو

تند آندھی نے بجھائے ہیں جو خوابوں کے دیئے
غم کی راتوں میں انھیں مونس وغم خوار کہو

آئینہ خانۂ تصویر ہیں سب دشت و دمن
ابن آدمؑ ہی کو اب دہر کا معمار کہو

لب گویا

اک نیا زخم لگا جائے جو دل پر یارو
ایسی ہر یاد کو تم باعثِ آزار کہو

بے سکوں روح ہر اک جسم میں پوشیدہ ہے
ان کمیں گاہوں کو سمجھنے پہ اداکار کہو

میرا ہر شعر ہے اک لائحۂ فکر و عمل
میری غزلوں کو نئے دور کا معیار کہو

زندگی منتِ اربابِ ستم ہے امید
آدمی کو غم و آلام کا رہوار کہو

○

علی عباس امید

جون کا سورج

پہلے کچھ دیر تو دیکھا اسے حیراں ہو کر
اور
پھر اس کی شرارت سے پریشاں ہو کر
سر پھرے بچے کو
استاد نے
ٹیبل پر کھڑا کر ہی دیا

سارے دن
غصّہ میں بھرا بھرا
خشمگیں نظروں سے
وہ آگ اگلتا ہی رہا
اور
پھر شام کو
لب گویا

جب سائے کی
دہلیز سجی
وہ شریر آنکھیں بچا کر سب کی
پچھلی کھڑکی سے
روپوش ہوا

○

دیکھا آپ نے، جس جگہ یہ شاعر کھڑا ہے وہاں سے کتنی گلیاں نکلتی ہیں اور گلیوں کے اس جال میں پھنسے ہوئے علی عباس کا قلم جب یہ شعر لکھتا ہے ؎

یہ روز و شب کی صعوبت سزا سہی امتید
ہے جس گنہ کی سزا اس کا ارتکاب تو ہو

تو یہ شعر پڑھ کر قاری کی حیثیت سے میرا جی خوش ہو گیا اور مجھے لگا کہ علی عباس امتید کے شعروں کے گلی کوچوں کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔ ●

بمبئی

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

تذکرہ ہے آرزوؤں کا نہ امیدوں کی بات
اک متاعِ زیست تھی وہ بھی ہے نذرِ حادثات

منزلِ غم تک گئے لے کر جنوں کی روشنی
تب کہیں ہمراہ آیا ہے شعورِ کائنات

قہقہے بکھرے ہوئے ہیں حلقہ ہائے جام میں
لے رہی ہے کروٹیں سڑکوں پہ پژمردہ حیات

کوئی سایہ بھی نہیں شہرِ وفا کے موڑ پر
کون دہرائے تمنا کے بھٹکتے واقعات

اپنے کاندھے پر لئے اپنی صلیبِ آرزو
آج تیری منتظر ہر سانس ہے یومِ نجات

لب گیا

رہروانِ زیست کو آساں ہوئی ہیں منزلیں
پھر غمِ دوراں نے شاید دیدیا ہاتھوں میں ہات

چاہیئے اب ایسا سورج جو بنے مرہم امید
آدمی پر ہے ابھی سایہ فگن زخموں کی رات

علی عباس امید

اب تو جلتے ہوئے لمحات سے باتیں کر لیں
صبح لانی ہے تو پھر رات سے باتیں کر لیں

ان کی دلجوئی ضروری ہے حقائق کے لئے
کچھ گماں کی سنیں، شبہات سے باتیں کر لیں

روح سے انس سہی جسم کو بھولیں کیسے
آیئے بڑھ کے روایات سے باتیں کر لیں

انگنت راتوں نے خوں دے کے گرہا ہے سورج
اس کو بجھنے نہ دیں ظلمات سے باتیں کر لیں

نغمگی سو گئی پژمردہ ہے تاروں کا جہاں
اب ہے کیا فیصلہ جذبات سے باتیں کر لیں

لبِ گویا

دل کہ نادان ہے پوچھے گا حقیقت کا سراغ
کیوں نہ آئینۂ حالات سے باتیں کرلیں

حسیں خواب نہ چمکائیں گے ذہنوں کے افق
چل کے ہم شوخ خیالات سے باتیں کرلیں

پتیاں سبز ہوئیں، پھولوں نے چولے بدلے
آپ اب موسم برسات سے باتیں کرلیں

اک نئے موڑ کا طالب ہے قلم بھی امید
ہمسفر کون ہو نغمات سے باتیں کرلیں

○

علی عباس امید

فرسٹریشن

دشمن ہوش
نغمہ آرائی

پاؤچ
میرا رفیق تنہائی
یہ کتابیں، رسائل اور اخبار
بن گئے ہیں فسون زیبائی

اجنبی خط
پیام رسوائی
کون بتلائے زندگی کیا ہے
زہر کے گھونٹ ہر نئے لمحہ
پیش کرتے ہیں کیوں دلآرائی
جی میں آتا ہے سارے گھونٹوں کو
تلخ تر

لب گویا

اور

تلخ تر کر دوں

چلتے ہیں ساتھ ساتھ صداؤں کے سلسلے
لیکن جدا جدا ہیں اسی کارواں سے ہم

علی عباس امید

میں نے جس کو چاہت کی نرم چھاؤں بخشی تھی
اس کی یاد کا سورج اب مجھے جلاتا ہے

راستہ بنایا تھا جس کا خود ہواؤں نے
خامشی کے صحرا میں شور بن کے آتا ہے

میری آس ٹانکی ہے آج اس نے جوڑے میں
ہونٹ چھلکے پڑتے ہیں، جسم مسکراتا ہے

پتیاں تو بے جڑ ہیں خواہشوں سی بکھریں گی
کیوں یہ دل زدہ موسم آج گنگناتا ہے

خودکشی کے منصوبے اس صدی کی قسمت ہیں
زندگی وہ قصہ ہے جو لہو رلاتا ہے

چاندنی کی باہنوں میں پھول سا بدن دے کر
روز اپنے سینے میں وہ شرر چھپا لتا ہے

اس امید کو ہم بھی جانتے ہیں مدت سے
زلزلوں کی بستی میں جو مکاں بناتا ہے

○

نوکِ خار

ہزاروں سال لمبا راستہ
طے کر کے ہم تہذیب کے اس موڑ تک پہنچے

سفر کی گرد چہرے سے ابھی دھونے نہ پائے تھے
ابھی اس موڑ کے ملنے پہ ہم مسرور بھی ہونے نہ پائے تھے
کہ یکسر حوصلہ کھونا پڑا ہے
قدم صدیوں پہ رکھنا جس کی انگلی تھام کر سیکھا
اسی تہذیب کو رونا پڑا ہے۔

○

جنریشن کا دکھ

زندگی جائے کہاں!
زندگی ریت ہے اور ریت سے بوجھل لمحات
جاں بلب، تشنگیٔ چشم لئے
اک کھنکتے ہوئے چشمے کے تعاقب میں ہنوز
کچے شیشوں کی طرح چھن سے بکھر جاتے ہیں
نہ کوئی حرفِ تسلی،
نہ دوا ہے نہ دعا ——

زندگی جائے کہاں!
زندگی کس سے ملے، کس سے کہے ——
ابرِ خوں گشتہ ملا
بادِ سرافگار ملی
صبح بھی شام کی مانند گنہگار ملی.....

علی عباس امید

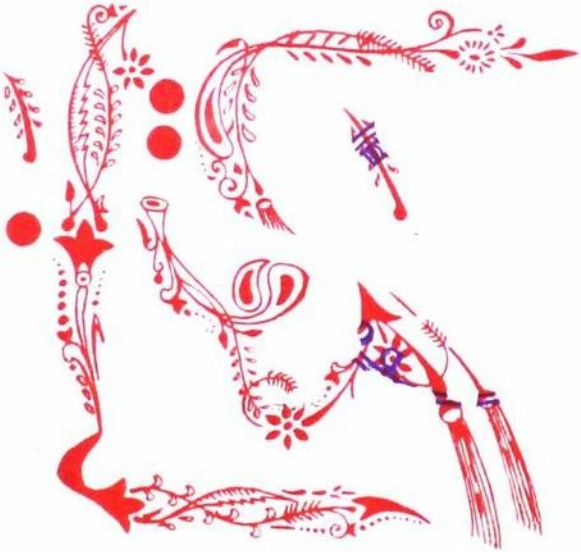

علی عباس امید صاحب کے کلام کے مطالعہ سے مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شاعری کا مرکزی کردار سورج ہے۔ یہ کردار بہ یک وقت دائرے کا نقطہ بھی ہے اور روشنی پھیلانے پر معمور بھی، گویا سورج دائرے کے حصار میں محبوس رہنے کے باوجود ہمہ وقت اس حصار کو عبور کر کے چاروں طرف پھیل جانے کی آرزو سے سرشار ہے، چونکہ کسی شاعر کے کلام میں ابھرنے والا مرکزی کردار دراصل اس کی شبیہہ ہوتا ہے اس لئے اس بات کے اظہار میں مجھے تامل نہیں کہ امید صاحب کے یہاں وجود کی دیواروں اور حد بندیوں کو توڑ کر لامحدود میں ضم ہو جانے کی آرزو بہت توانا ہے۔ اس آرزو کا جوہر (CORE) صوفیا کے مسلک سے مشابہ ہے جب کہ اس جوہر کا اظہار فنی پیرائے میں ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی ذات سے باہر نکلنے کی آرزو، ایک ننھی سی مچھلی کی طرح انجان لہروں میں کھو جانے کا عزم اور ایک بیکراں اور عظیم تر نقطے کی تلاش۔ یہ سب کچھ دگوں میں دوڑتے پھرتے لہو میں بھیگ کر ایک ایسی تمازت اور خوشبو میں ڈھل گیا ہے جو تخلیق کاری کے عمل ہی میں اجاگر ہوتی ہے۔

روشنی کی کارکردگی کو دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو اس زاویہ سے کہ روشنی تاریکیوں کے لامتناہی سلسلوں کو ختم کرتی ہے۔ دوسرے اس زاویہ سے کہ وہ خود دور دور تک پھیلنے کا اہتمام کرتی ہے سورج کی روشنی کا اندھیرے پر غالب آنے کا ایک مذہبی اور مابعد الطبیعاتی پس منظر بھی ہے جسے یہاں زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں گو امید کے کلام میں جا بجا اس کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔ امید لب گویا

زندگی جائے کہاں!
——— زندگی بھول گئی قصۂ جاں!!

زندگی خواب تھی اور خواب کا دلکش خاکہ
مدتوں بعد کئی رنگوں سے سرشار ہوا
وقت کے کھردرے ہاتھوں نہ یہ چاہا اک بار
اس حسیں خاکہ پہ بکھرا دے تعصب کا غبار
تاکہ وہ نقطے جو بیدار بھی، ہشیار بھی تھے
دلنشیں خاکہ کی آغوش میں بوجھل بوجھل
نیم خوابیدہ رہیں ———
رنگ کی حس کو فراموش کریں •

زندگی خواب تھی اور خواب کی رنگیں تعبیر
وقت کے ہاتھوں بکھرنے کو تھی لیکن اک روز
تاک کی شاخ جو برسوں سے ملی تھی نہ ڈلی
اپنی خوشبو سے شرابور اٹھی
سنسناتی ہوئی حق بیز ہواؤں سے ملی
——— برق سی کوند گئی ———
وقت کے کھردرے ہاتھوں سے تعصب کا غبار

اس طرح بکھرا کہ خود وقت کی آنکھوں کی چمک
اپنی مژگاں کے سفیروں کے جلو میں نکلی
اور پھر
شب کے سمندر میں کہیں ڈوب گئی ●

زندگی بھول گئی قصۂ جاں ——
تاک کی شاخ جو خوشبو سے شرابور اٹھی تھی اس روز
وہ فقط شاخ نہیں
رنگوں کا پیغام بھی تھی
مٹتے حافظے کے لئے ذہن کا انعام بھی تھی
فکرِ امروز بھی تھی، قصۂ ایام بھی تھی
سنسناتی ہوئی حق بیز ہواؤں کا سرانجام بھی تھی
بے حسی لاتے ہوئے وقت کو دشنام بھی تھی
تاک کی شاخ بھی تھی
زیست کا الہام بھی تھی ○

زندگی بھول گئی قصۂ جاں ——
زندگی جائے کہاں؟

ابر خوں گشتہ سہی
باد سرافگار سہی

صبح بھی شام کی مانند گنہگار سہی
زندگی! کاش کبھی

تجھ میں یہ احساس جگے
...ناک کی شاخ ہے خوشبوؤں سے بوجھل اب بھی
شب کو آئینہ دیکھاتی ہے مسلسل اب بھی •

زندگی!

ریت نہ بن
کچے شیشوں کی طرح چھن سے بکھرنا کیسا
اک کھنکتے ہوئے چشمے کے تعاقب میں بھٹکنا کیسا
زندگی چونک، مناسب نہیں اب خوابِ گراں
زندگی اور وہی، اور وہی قصۂ جاں ••

علی عبّاس امیّد

میں ــــــ ان راہوں کا مسافر ہوں
جن پر منزل کبھی نہیں آتی
چلتے رہنا میرا مقدر ہے
اور سفر کی گرد میری ہمسفر ہے
نس نس سے روشنی نچوڑ کر
ان راہوں کو اجالا بخشنا میرا مشغلہ ہے۔

لفظوں کی آنچ پر احساس کو سینکنا
اور
پھر وقت، جو میرا کاغذ ہے، اس پر
اپنے عہد کے اور
آنے والے زمانہ کے
تمام انسانوں کے لئے

علی عبّاس امیّد

اپنے معصوم خوابوں کے منشور تحریر کرنا ہی
میری زندگی ہے

تھک کر بیٹھ رہنا
مجھے گوارا نہیں!
زندگی سفر ہے، ایک مسلسل سفر
اور اس سفر کا انجام ——
جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا
اور وہ منزل ——
وہ بھی نئی ہو گی
بالکل نئی •

پھر بھی، میں، مایوس نہیں
آرزوئیں جوان اور حوصلے بلند ہیں
اور سفر جاری ہے
سفر جو ہر حال سفر ہے!
سفر جو نویدِ منزل ہے!!

○

علی عبّاس امّید

کی

کتابیں

نگارِ غالب (غالبیات)

لہو لہو (رثائی شاعری)

آفاقی المیہ (مذہبیات۔ اردو)

مہتی دیوتا (مذہبیات۔ ہندی)

پتّھروں کا شہر (طویل نظم)

ننّھی منّی کہانیاں (بچوں کے لئے کہانیاں)

لبِ گویا (اردو شاعری)

قلم کا درد (ہندی شاعری)

زیرِ طبع

پروانے کی خاک (ڈرامہ)

اسیرے (انگریزی شاعری)

زیرِ ترتیب

قصہ تیسرے درویش کا (طنز و مزاح)

خوشبوؤں کے رشتے (افسانے)

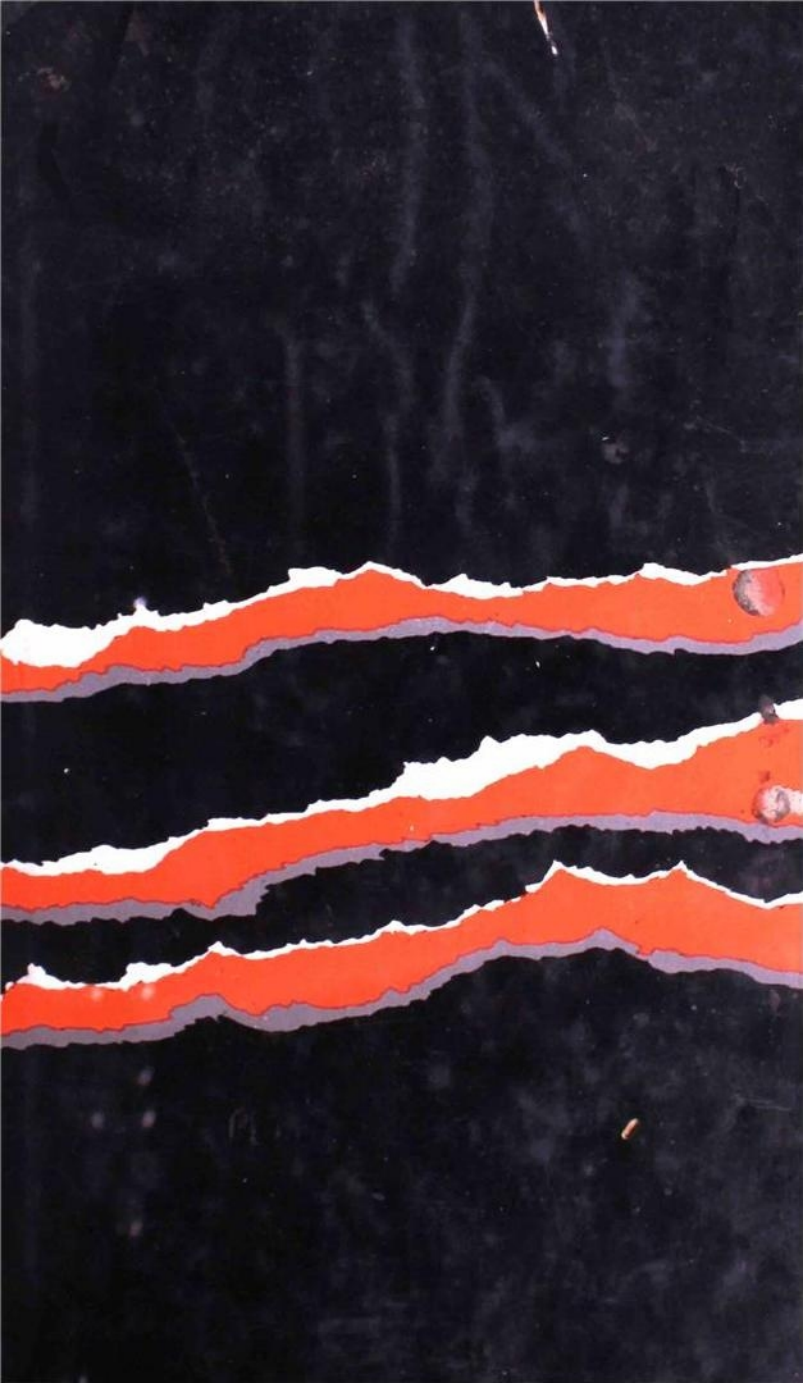

بیسویں صدی کا انسان ہے لہٰذا اس نے چاروں اطراف میں جہالت، منافقت، تنگ نظری، انتقام اور بے راہ روی کی جس دھواں دھواں کیفیت کو دیکھا ہے۔ وہ شاید آج سے پہلے اتنی شدت اور عالم گیریت کے ساتھ کبھی سامنے نہیں آئی تھی۔ آج انسان نے علم، تہذیب، شرافت اور دوسری جملہ ملائم کومل اور روشن چیزوں کو اپنی حیوانیت کے ایک ہی وار سے ملیامیٹ کرنے اور یوں اندھیرے کی ایک دبیز چادر اوڑھ کر سو جانے کا جو رویہ اختیار کیا ہے۔ امید اس پر کڑھتا ہے اور اس کا کلام اس کرب کی تمازت سے پگھل کر لو دینے لگتا ہے۔ اندھیرے کے امنڈنے اور روشنی کی آخری رمق سے دست و گریباں ہونے کے عمل کو امید نے اپنے اشعار میں بار بار اجاگر کیا ہے۔

صدا بہ صحرا ہیں چیخیں، دریدہ جسم زمین
تمام دل زدہ چہرے، بجھی بجھی نظریں
تمام بکھرے ارادے، دھواں دھواں یادیں

. . . . . .

ہوا میں، آگ میں، پانی میں ٹوٹتے رشتے
شکستہ قصر محبت اداس نسلوں کا

(خالی لمحوں کی نظم)

پھر دبے پاؤں
دن کی ارتھی پر
بال بکھرائے شام آپہنچی

(ایک پرانا سوال)

ٹوٹ کر چاند گرا غار سیہ میں، آنکھیں
بجھ گئیں محفل انجم کی، سبک رو شمعیں
سرنگوں، مہر بہ لب پہلے تو کچھ دیر جلیں

تاب باقی نہ رہی جب تو سیہہ پوش ہوئیں
اور پھر چاروں طرف
رات کا آنچل پھیلا

(آگہی کے ویرانے)

شام کے سر منی آنچل پہ گھٹا بکھری ہے
روشنی دست و گریباں ہے تاریکی سے
رات کے آنے میں باقی ہیں ابھی کچھ گھڑیاں

(مداوا)

گویا امید نے زمانۂ حال میں بھی روشنی اور تاریکی (خیر اور شر) کے قدیم دنگل کی کارفرمائی کو لکھ لیا ہے اور اسے اس بات کا عرفان حاصل ہو گیا ہے کہ تاریکی کا علاج روشنی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر یہ تو روشنی کا اصلاحی اور اخلاقی پہلو ہوا جس کی اہمیت کا احساس تمام معلمانِ اخلاق اور انسان کی بھلائی کی آرزو کرنے والی تمام مقتدر ہستیوں نے دلایا ہے ان لوگوں نے نہ صرف انسان کو باہر کی تاریکی کے خلاف صف آرا ہونے کی تحریک دی بلکہ اسے اپنے سینے کی اعماق میں پوشیدہ اندھیرے کو بھی بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکنے پر آمادہ کیا۔ مگر روشنی کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اصلاح احوال کے بجائے اثباتِ ذات کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، یعنی سورج اپنی روشنی سے محض اندھیرے ہی کو دور نہیں کرتا بلکہ اپنی شعاعوں کی مدد سے خود کو دور دور تک پھیلانے کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ یہ عمل صوفیا کے یہاں بہ طور خاص بہت نمایاں ہوا ہے۔

سلیم عارف صاحب نے مجھے علی عباس امید کے جو شخصی کوائف بھیجے ہیں ان کے مطابق امید کی پیدائش جولائی ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ گویا اس وقت اس کی عمر چھتیس برس سے زیادہ نہیں۔ مجھے یہ بات جان کر حیرت ہوئی کہ امید نے چالیس کے مقدس سن کو چھونے سے قبل ہی روشنی کی اس کارکردگی کا عرفان کیسے حاصل کر لیا مگر دنیائے ادب میں قبل از وقت بلوغت کی مثالیں ناپید نہیں ہیں۔ میرا جی سینتیس برس کی عمر میں وفات پا گئے لب گویا

لیکن وفات سے پہلے وہ ایسی نظمیں لکھ رہے تھے جن میں اثبات ذات کا پہلو پوری طرح اجاگر ہو چکا ہے۔ ٹالسٹائی جب سینتیس برس کا ہوا تو اسے موت (اندھیرے) کے وجود کا احساس اس شدت سے ہونے لگا کہ اس نے اپنی ہر تحریر کی پیشانی پر "اگر میں زندہ رہا" کے الفاظ لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ چونکہ اندھیرے کے وجود کا احساس اندر کی روشنی کو مہمیز لگانے کا باعث ہوتا ہے اس لئے میں ٹالسٹائی کے اس خوف کو اثبات ذات ہی کی طرف ایک قدم قرار دیتا ہوں۔ علی عباس امید نے اپنے کلام میں جا بجا ذات کے نقطے سے پھیل کر چاروں طرف جانے یا ذات کے نقطے کے اندر ایک بیکراں وسعت کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے MACRO COSM اور MACRO COSM دونوں کے اندر پھیلنے کی آرزو کی ہے۔ یہ چند مثالیں قابل غور ہیں۔

بہت کچھ سہہ چکا ہوں اب
اسے کچھ اور وسعت اور وسعت اور وسعت دو
اگر ممکن نہ ہو یہ تو مجھی کو مختصر کر دو
میں اتنا مختصر ہو جاؤں، ایسا گھٹ کے ہو جاؤں
کہ اس تنگی کو لامحدود سمجھوں
اگر سب کچھ بیکراں معلوم ہو مجھ کو
ہر اک شے کو تکوں حیرت سے اور پھر میں
کسی ننھی سی مچھلی کی طرح
انجان لہروں اور طوفانوں میں کھو جاؤں

(قلم کا کرب)

دیار دل تھا وہ جہاں
جدائیوں کی تیرگی میں
شمع آگہی جلی
بکھر گئی کلی کلی

علی عباس امید

بائیس

سرابِ تشنگی کی رو
چراغِ نیستی کی لو
مگر کچھ اور بھی بڑھی
مگر کچھ اور بھی بڑھی

(روداد)

ہزاروں لہروں کے دائروں کا ہے ایک مرکز
وہ ایک نقطہ
جو لاتعلق ہے دائروں سے
مگر جو شامل ہے دائروں میں
میں دائروں میں بھٹک رہا ہوں
وہ ایک نقطہ
عدم اور ہستی کا ہے جو محور
عدم اور ہستی کے درمیاں ہے
جو کچھ نہیں ہے، کہیں نہیں ہے
وہ بیکراں ہے، عظیم تر ہے
اس کی بس مجھ کو جستجو ہے

(تلاش)

سرخ رو سورج کے چہرے پر ہے خوابوں کا لہو
شام بے غازہ تھی لیکن اب سحر میں کچھ تو ہے

میں تو چراغ بن کے مسلسل جلا کیا
وہ پوچھتے ہیں پھیلے اجالے کہاں کہاں

لبِ گویا

تیئیس

افق سے تا بہ افق نور بن کے پھیلا ہوں
میں روشنی ہوں کہ تاریکیوں کا پردا ہوں

انھیں بتاؤ میں پھیلا ہوں کتنی صدیوں میں
جو مانتے ہیں بڑی چیز ہے یہ سال اپنا

میں پہلے ذات کے صحرا میں خود شناس ہوا
گجر کی طرح پھر اس خامشی میں گونجا ہوں

طویل سوچ ہے اور مختصر لہو میرا
گراں سفر میں ہے زاد سفر لہو میرا

تم سے تو آگے میری پرچھائیں ہے
سست رفتاری کا شکوہ بوالعجب

دل کی طرح دھڑکتا ہوں میں کائنات میں
میری طرف بھی دیکھئے فرصت اگر ملے

اگر فضاؤں میں لکھنا ہو اپنا نام تمہیں
فصیل جسم سے باہر نکل چلو لوگو
سفر حیات کا دشوار تو بہت ہے مگر
نکل پڑا ہوں تو ہر موڑ سے گزر جاؤں

علی عباس امید

کھڑکیاں ہی کھول لیں گر بند دروازہ رہے
آتے جاتے موسموں کا کچھ تو اندازہ رہے

ان تمام اشعار سے دو تین باتیں فی الفور واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر فصیلِ جسم، بند مکان یا ذات کے صحرا سے باہر نکلنے اور پھیلنے کا آرزو مند ہے۔ دوسری یہ کہ وہ ایک مسلسل سفر میں رہنے کا طالب ہے۔ تیسری یہ کہ یہ سفر سورج کے سفر کے مماثل ہے اور سورج کو کام محض یہی نہیں کہ وہ ایک نقطے کے گرد سفر کرتا ہے بلکہ وہ اس روشنی کو جنم بھی دیتا ہے جو بے پناہ رفتار کے ساتھ باہر کی طرف بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ سورج وجود کی قید کے اندر تو ہے مگر اسے وجود کے حصار کے باہر کی دنیا کا عرفان بھی ہے۔ گویا اس نے شجرِ ممنوعہ کے پھل کو چکھ لیا ہے اور اب تنہا بھی ہے اور اپنے وجود کو گنوا بیٹھنے کے کرب میں مبتلا بھی۔ امید لکھتا ہے

مرے قدم بھی کوئی شام کاش تھام لیتی
مرا سفر بھی تو سورج کی طرح تنہا ہے

اور پھر

سیاہ رات کے آنگن میں سوچتا ہوں میں
نکل کے شہر سے سورج کا کیا بنا ہوگا

جواب یہ ہے کہ وہی کچھ جو قطرہ کا سمندر میں گرنے کے بعد بنتا ہے۔ یا شعاع کا روشنی میں ضم ہونے کے بعد ...... تنہائی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان انبوہ میں رہتے ہوئے بھی تنہا ہو۔ دوسری یہ کہ وہ ساری کائنات سے اس طور پر ہم آہنگ ہو جائے کہ تنہائی ایک ثمر شیریں کی طرح اس کی جھولی میں آن گرے۔ محبت کی انتہا یہ ہے کہ دو محبت کرنے والے ایک دوسرے کی ذات میں اس طور ضم ہو جائیں کہ یکتائی یعنی تنہائی کی صورت پیدا ہو جائے۔ علی عباس امید جس انداز میں "ہست" کی طرف بڑھ رہے ہیں اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ کسی روز وہ محسوس کریں گے کہ ان کے سوا باقی سب کچھ "نیست" ہو گیا ہے اور وہ ایک عظیم "تنہائی" سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

لاہور — ڈاکٹر وزیر آغا

لبِ گویا

حمد

سر بہ سجدہ ہے قلم کیسے تمنا لکھوں
ماورائے فکر کی حد سے ہے تجھے کیا لکھوں

ابتدا، وقت کی حد، صبح ازل، شام ابد
حق تو یہ ہے کہ میں کچھ ان کے علاوہ لکھوں

لامکاں تو مخفی ہے، تیری ہی خبر اللہ
صفحۂ حال پہ ماضی کو بھی فردا لکھوں

آسماں، سمت، زمیں، ذہن، خطا اور عطا
پہلے ان سب کو پڑھوں پھر تجھے تنہا لکھوں

حرف بھی تو ہے، عبارت بھی ترے نور کا عکس
پھر بھی گمراہ ہوں گر تجھ کو صحیفہ لکھوں

میں کہ عاصی ہوں طلب آخری منزل میری
تو کہ رحمت ہے تجھے کیسے نہ وعدہ لکھوں

مجھ کو احساس ہے کوتاہیٔ فن کا امید
اور کچھ لکھ نہیں سکتا ہوں تو سجدہ لکھوں

علی عباس امید

نوید صبح ستاروں کو جب ملا ہوگا
تو ایک چہرہ کہیں بام پر کھلا ہوگا

سیاہ رات کے آنگن میں سوچتا ہوں میں
نکل کے شہر سے سورج کا کیا بنا ہوگا

مرے خیال کی سرحد سے تم جو گزرو گے
تمہیں بتاؤ مرے دل کا حال کیا ہوگا

جمی تھیں کتنی ہی آنکھیں افق کی سرخی پر
کوئی سمجھ ہی نہ پایا کہ کیا ہوا ہوگا

اسی یقین پہ سر کر لیا ہے دشت طلب
طلسم شوق کے باہر تو سامنا ہوگا

لب گویا

یہ سوچتے رہے جھونکے تری تلاش کے بعد
کہ چاند بھی تو سمندر میں ڈوبتا ہوگا

دیارِ چشم میں روشن ہیں نقرئی شمعیں
رو پہلی یادوں کا پھر آج رتجگا ہوگا

وہ ایک لمحہ جو صدیوں کو زیر کر آئے
اس ایک لمحے میں کچھ بھی تو فیصلہ ہوگا

میں دشتِ وعدہ سے گزروں گا جب کبھی امید
تو میرے ساتھ گھٹاؤں کا قافلہ ہوگا

○

لب گویا

علی عبّاس امیدؔ

کل ہند۔ حلقۂ ادب، عابدی منزل، بربرہنہ، غازی پور
۲۳۳۰۰۱

اتنے افسردہ نہ ہو دیوار و در میں کچھ تو ہے
دشت میں سبزہ نہ تھا ویران گھر میں کچھ تو ہے

بھولے بسرے دل کا بھی آجاتا ہے اکثر خیال
قحطِ احساسات میں بھی اس نظر میں کچھ تو ہے

سرد صبحوں نے کیا تھا جتنے دروازوں کو بند
اب وہ کھلنا چاہتے ہیں دوپہر میں کچھ تو ہے

لفظ پہلے گونج تھا پھر مل گیا معنی اسے
کچھ نہ تھا منزل پہ لیکن اب سفر میں کچھ تو ہے

تیز و لمحات نے ذہنوں کو ویران کر دیا
اے وہ سودا ہی سہی شوریدہ سر میں کچھ تو ہے

لبِ گویا

ناتوانی سرگراں ہے پھر بھی زندہ ہے امنگ
اڑ نہیں سکتا مگر اس مشت پر میں کچھ تو ہے

سرخ رو سورج کے عارض پر ہے خوابوں کا لہو
شام بے غازہ تھی لیکن اب سحر میں کچھ تو ہے

دھند کا اک سلسلہ در سلسلہ آنکھوں میں ہے
جستجو تیرے لئے بھی خشک و تر میں کچھ تو ہے

ہر طرف کرب عمل اور بے یقینی ہے رواں
پھر بھی ہے امید تیرے ہی نگر میں کچھ تو ہے

○

روداد

دیار دل تھا وہ جہاں
جدائیوں کی تیرگی میں
شمع آگہی جلی

بلند و پست
نور و نار
باوقار و بے قرار
کچھ الجھنیں کچھ انتشار
اک ایک پل سے آشکار
حقیقتوں کا انتظار
بدن کا لمس
(جس، جس)
ہواؤں کی رہین بجتی کھڑکیاں

لبِ گویا

صداؤں کے لبوں پہ کھلتی بجلیاں
بندھی حیات کی چٹان صرف ایک ڈور سے
کچھ اور بڑھتی خامشی رباب غم کے شور سے
حد نگاہ تک فقط
بس ایک دشت نابلد

نہ کوئی حد، نہ جزر و مد
ہر اک نگاہ مسترد
حباب فن کا راز فاش
وہ کرب فکر پاش پاش
کسی طلسم کی تلاش
تمام طرز گفتگو
لہو، لہو، لہو، لہو

دیار دل تھا وہ جہاں
جدائیوں کی تیرگی نہیں
شمع آگہی جلی
بکھر گئی کلی کلی
سراب تشنگی کی رو
چراغ نیستی کی لو
مگر کچھ اور بھی بڑھی
مگر کچھ اور بھی بڑھی

○

نکلا ہے تو پڑاؤ وہ ڈالے کہاں کہاں
کیا جانے میرا نام اچھالے کہاں کہاں

میں تو چراغ بن کے مسلسل جلا کیا
وہ پوچھتے ہیں پھیلے اجالے کہاں کہاں

گھر، کاروبار، دوست، خبر، کرب آگہی
گھوم آیا اتنے بوجھ سنبھالے کہاں کہاں

تجھ سے بچھڑنے والے بڑے باکمال تھے
تعمیر کر گئے ہیں شوالے کہاں کہاں

گردش مرا نصیب سہی یہ تو ہو خبر
بچھڑیں گے مجھ سے پاؤں کے چھالے کہاں کہاں

تم چھیڑ بیٹھنا نہ کہیں میرا تذکرہ
وہ ڈھونڈتا پھرے گا حوالے کہاں کہاں

اس کا خیال چاند کی صورت چمک اٹھا
دل طے نہ کر سکا کہ سجالے کہاں کہاں

کہہ لینا شعر پہلے کسی سے یہ پوچھ لو
اللہ میں چھپ رہے ہیں رسالے کہاں کہاں

مایوسیوں کی صبح سے شام امید تک
پیتا رہا ہوں زہر کے پیالے کہاں کہاں

○

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

خالی لمحوں کی نظم

نہ منزلوں کا تعین نہ راستوں کا پتہ
سلگتی دھول، تپے پتھروں کے سینے پر
کبھی ملا نہ ملے گا کسی کا نقشِ پا

اسیرِ سیلِ گماں ہے عروسِ عمرِ رواں
لباسِ تنگ..... لہو رنگ
موجِ خوں پیاسی
صدا بہ صحرا ہیں چیخیں، دریدہ جسم زمیں
تمام دل زدہ چہرے، بجھی بجھی نظریں
تمام بکھرے ارادے، دھواں دھواں یادیں
قرآن و وید کا سایہ لہو کی گردش پر
پشیماں دشمنِ آدم خود اپنی سازش پر
ہوا میں، آگ میں، پانی میں ٹوٹتے رشتے

شکستہ قصرِ محبت اداس نسلوں کا
شکستہ سانس کی ابتر سی کوشش پیہم
وجود ڈھونڈنے کی ..... حادثوں کے صحرا میں
وجود ڈھونڈنے کی ..... فیصلوں کی وادی میں
شکستہ سانس کی سعیِ گراں، گرانمایہ
شکستہ سانس کی سعیِ گراں کا سرمایہ
اک اضطراب، تجسّس، فسردگی، الجھن
خیال و خواب کی لذت، حقیقتوں کی چبھن
شکستہ سانس کی سعیِ گراں کا سرمایہ

نہ منزلوں کا تعین نہ راستوں کا پتہ
سلگتی دھول، تپے پتھروں کے سینے پر
کبھی ملا نہ ملے گا کسی کا نقشِ پا

افق سے تا بہ افق نور بن کے پھیلا ہوں
میں روشنی ہوں کہ تاریکیوں کا پردا ہوں

بھٹک رہا ہے خلاؤں میں جشنِ نیم شبی
مگر ہے ضد کہ میں آسودۂ تمنا ہوں

مجھے ملا نہ سمندر کی وسعتوں کا سراغ
جو ریگ زار میں جا سویا ہے وہ دریا ہوں

میں پہلے ذات کے صحرا میں خود شناس ہوا
گجر کی طرح پھر اس خامشی میں گونجا ہوں

مجھے خبر نہیں ہمراہ کون تھا میرے
بچھڑ کے جس سے بھرے شہر میں بھی تنہا ہوں

©

علی عبّاس امید

سنہ اشاعت ——————— ۱۹۸۴ء

طباعت ——————— اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔

سرورق ——————— سریش چودھری

خوش نویس ——————— سہیل احمد، الہ آباد

ناشر ——————— کل ہند، حلقۂ ادب، عابدی منزل، بربرہنہ غازی پور

قیمت ——————— پچاس روپئے

تقسیم کار ——————— شب خون۔ ۳۱۳۔ رانی منڈی۔ الہ آباد۔

——————— بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال۔

ترتیب و تزئین ——————— کاظم عابدی

تمہیں یقین نہ آئے مگر حقیقت ہے
وہ نغمہ گر ہوں کہ خود اعتبارِ نغمہ ہوں

گزشتہ دور سے جن کا جواب بن نہ سکا
میں ایسے چند سوالوں سے اب بھی الجھا ہوں

وہ تیز گام ہوں آشوبِ روزگار کہ اب
فسانہ بن کے ترے راستے میں بکھرا ہوں

بہت سے لوگوں نے دیکھا مرا کلام مگر
کوئی سمجھ نہ سکا کس طرح میں زندہ ہوں

قلم کا کرب

ہر اک جملے میں پوشیدہ ہے بننا اور بکھر جانا
سنورنا، ٹوٹنا اور پھر الجھ جانا
میں لوٹ آیا ہوں
تنہا چھوڑ کر منزل کو
اک اک لفظ تنہا ہے

نہ جانے کتنے چہرے اوٹ سے لفظوں کی تکتے ہیں
انھیں کے درمیاں ہے ایک فق چہرہ
جو میری دوربیں نظروں سے الجھا ہے
مری راہوں میں حائل ہے
میں لوٹ آیا ہوں
منزل کو ادھورا چھوڑ کر
لیکن وہ فق چہرہ

مری نظروں کی راہیں روک کر
ان سے یہ کہتا ہے :

. . . . . .

ہر اک لمحہ یہ چہروں کی نئی فصلیں، یہ بکھری تیرگی
یہ ٹوٹتے لمحے
مری سانسوں کو مجھ سے چھیننے کی سعی کرتے ہیں
میں مجرم کی طرح اک ایک کو تکتا ہوں حسرت سے
کہ کوئی مہرباں ہو اور یہ محبس کشادہ ہو

. . . . . .

. . . . . .

بہت کچھ سہہ چکا میں اب
اسے کچھ اور وسعت اور وسعت اور وسعت دو
میں اتنا مختصر ہو جاؤں، گھٹ کے ایسا ہو جاؤں
کہ اس تنگی کو لامحدود سمجھوں
اور سب کچھ بیکراں معلوم ہو مجھ کو
ہر اک شئے کو تکوں حیرت سے اور پھر میں
کسی ننھی سی مچھلی کی طرح
انجان لہروں اور طوفانوں میں کھو جاؤں

میں لوٹ آیا ہوں منزل کو ادھورا چھوڑ کر
اور اب وہ فق چہرہ

مری نظروں کا پردہ ہے
مری راہوں میں حائل ہے

میرا، آپ کا، اس کا، سب کا یہ مقدر ہے
ناریل کے باغوں میں ڈھونڈتے رہیں سایہ

لبِ گو

تلاش

ہزاروں لہروں کے دائروں کا ہے ایک مرکز
وہ ایک نقطہ
جو لاتعلق ہے دائروں سے
مگر جو شامل ہے دائروں میں

میں دائروں میں بھٹک رہا ہوں
وہ ایک نقطہ
عدم اور ہستی کا ہے جو محور
(عدم اور ہستی کے درمیاں ہے)
جو کچھ نہیں ہے، کہیں نہیں ہے
وہ بے کراں ہے، عظیم تر ہے
اسی کی بس مجھ کو جستجو ہے

طویل سوچ ہے اور مختصر لہو میرا
گراں سفر میں ہے زادِ سفر لہو میرا

وہ رونقیں بھی گئیں اسکے خشک ہوتے ہی
سجاتا رہتا تھا دیوار و در لہو میرا

ہر ایک لمحہ مجھے زندگی نے قتل کیا
تمام عمر رہا میرے سر لہو میرا

دیارِ غیر کو مہکا گیا حنا بن کر
یہ واقعہ ہے رہا بے ہنر لہو میرا

وہ روح تھی جسے عہدِ وفا کا پاس نہ تھا
کبھی نہ چھوڑ سکا اپنا گھر لہو میرا

اجال دینگے اندھیروں کی یہ جبیں اک دن
بکھیرتا ہے کچھ ایسے شرر لہو میرا

رواں ہے قافلۂ فکر سوئے دشت جنوں
دکھا رہا ہے اسے رہ گزر لہو میرا

روانی لکھتی رہی جن کا نام آٹھ پہر
وہی بہا کے گئے خاک پر لہو میرا

نہ جانے کون سی رُت آگئی امید اب کے
چھپا نہ پائی مری چشم تر لہو میرا

کون کہہ سکتا ہے کھُل جائیں گے کب
باب رحمت کی طرح ہیں میرے لب

تم سے آگے تو مری پرچھائیں ہے
سست رفتاری کا شکوہ بوالعجب

جن کے سینے چھو رہے تھے آسماں
اپنی دھرتی سے وہی ڈرتے ہیں اب

لے گیا جو میرے گھر کی چاندنی
کاش لکھ جائے اسی کے نام شب

ہم نے فکر و فن کی بخشش دی اسے
ہم کو کیا دے گا بھلا ملک ادب
لبِ گویا

نصف منزل پر خیال آیا امید
آج تک چلتا رہا ہوں بے سبب

ڈھہ گئے یاد کے کھنڈر سارے
اب کے برسات کچھ غنیمت ہے

علی عباس امید

ایک پرانا سوال

پھر دبے پاؤں
دن کی ارتھی پر
بال بکھرائے شام آ پہنچی

وقت کے کینوس پہ کچھ چہرے
سر جھکائے، خموش، پابستہ
اپنے آنسو چھپائے دانستہ
پوچھتے ہیں سفید لمحوں سے
تم نے

کل

ہم سے زندگی لی تھی!

آج

لب گویا

امی کے نام

سورج کو
کس نے قتل کیا؟

وہ دوست تھا تو گلے تھے ہزار ہا لیکن
رہا نہ ربط تو ساری شکایتیں بھی گئیں

علی عباس امید

آگہی کے ویرانے

چاند نے
داغوں کو دھونا چاہا
تاکہ پرنور بدن
دادنی احساس کو روشن کر دے

چشمۂ صبح کی جانب
وہ بڑھا جیسے ہی
مرمریں کرنوں پہ
سفاک اندھیروں کا ہجوم
حملہ آور ہوا
قزاقِ اجل کی مانند
ٹوٹ کر چاند گرا غارِ سیہ میں، آنکھیں
بجھ گئیں محفلِ انجم کی، سبک رو شمعیں

سرنگوں، مہر بہ لب پہلے تو کچھ دیر جلیں
تاب باقی نہ رہی جب تو سیہہ پوش ہوئیں
اور پھر چار طرف
رات کا آنچل پھیلا

○

آپ امیدؔ سے ملیں تو سہی
فی زمانہ بہت غنیمت ہے

علی عباس امیدؔ

چاند اترا تھا مرے گھر میں تمنا بن کر
پھر بھی میں دیکھ نہ پایا اسے لمحہ بن کر

قصۂ دشت طلب چھیڑنے والوں سے کہو
درد کی دھوپ میں تپتے رہے غنچہ بن کر

جب تبسم کی گھٹا اٹھی تو دیکھا ہم نے
کرب نے پیار سے بوسہ لیا صہبا بن کر

ہم اندھیروں میں بھلا بیٹھے تھے سورج کو مگر
اس نے خود ذہن کو چمکا دیا رشتہ بن کر

آسماں کی طرح وہ جھک گیا قدموں میں ترے
پھر بھی تو دیکھتا ہے اس کو ثریا بن کر

اکیادن

جو ترے لمس سے محروم ہیں اے بادِ صبا
کاش ٹپکوں میں انھیں غنچوں پہ قطرہ بن کر

مسکن روح پہ آئی ہے کچھ اس طرح بہار
زخم کے پھول کبھی کھلتے نہیں تماشہ بن کر

تو مرے شہر سے جانے کا ارادہ کر لے
پھیل جاؤں گا میں خود ہی ترا رستہ بن کر

اب تقاضا ہے یہ بڑھتی ہوئی ظلمت کا امید
فن کی راہوں پہ بکھر جائیے فردا بن کر

○

علی عباس امید

پت جھڑ کی نظم

گھٹے گھٹے سے در و بام اور نگھتی گلیاں
خرد کی راہگزر پر جنوں کا سیل رواں
مہیب وقت کے پہلو میں آرزو حیراں
امید مہر بہ لب، چشم آشتی گریاں
لطیف خواب کی آنکھوں سے دل کا کرب عیاں
در حیات پہ یکسر ہجوم تشنہ دہاں
ہر ایک روح کے مرقد پہ زیست نوحہ کناں
نگار کیف کی زینت ہے گو یہ پنہاں
ہر ایک سانس مسلط ہے مثل کوہ گراں
اسیر حلقۂ دہشت ہر اک عروس زباں
ہر اک خیال رسن بستہ، آبرو عریاں
دیار حسن میں ہر سو بجائے شعلۂ دھواں
کہیں پہ معرکۂ جاں، کہیں پہ سوز نہاں

ترپن

وفا کی بزم میں بھی صرف تیرگی کا سماں
خود اپنے خون میں لتھڑے شکستہ دلِ انساں
رہِ سکون میں حائل ہزار ہا طوفاں
ہر ایک پھول فسردہ، کلی کلی لرزاں
بہار پھیر گئی ہے چمن پہ رنگِ خزاں

علی عباس امید

کتنے ہی سائے یوں تو سرِ راہ گزر ملے
لیکن میں ان کے ساتھ تھا جو تیز تر ملے

دل کی طرح دھڑکتا ہوں میں کائنات میں
میری طرف بھی دیکھئے فرصت اگر ملے

سورج بھی چپ ہے تیرہ شبی کے مکان میں
ہونٹوں کے پھول کیا کھلیں جب چشم تر ملے

جلتی رہی چراغوں کے مانند تیرگی
سائے میں لوحِ جسم کے کچھ نوحہ گر ملے

اعجاز ہم نے یہ بھی دکھایا اس عہد میں
گر شام سے ملے تو بہ رنگِ سحر ملے

لبِ گویا

یہ دھوپ ہے، یہ سایہ ہے، یہ تیرگی، یہ شمع
اس وہم میں اسیر اگر شہر بھر ملے

بکھری ہوئی تھی دھول زمانے کی ہر طرف
پھر بھی تمہارے پیار سے ہم در بہ در ملے

امید ہے یقیں کہ الٹ دے بساطِ شر
اس تازہ کربلا کو بھی شبیرؑ گر ملے

صلیب بردوش

جانے کب چھیڑا تھا مطرب نے ترانہ غم کا
از زمیں تا بہ فلک
گونج ہے باقی اب تک
آنکھ میں گرد ہے یادوں کی
دھواں چھایا ہے
ہاتھ میں دامن حسرت ہے
دریدہ وہ بھی

نور برساتی ہوئی رشک ارم تھیں راتیں
گل فشاں خوابوں کی خوشبو بھری چادر کے تلے
آنکھوں ہی آنکھوں میں آنکھوں سے دلوں کی باتیں
روح کے ساز پہ جیسے چھڑے پر کیف غزل
شبنم کیف

لب گویا

انسان کائنات کا لبِ گویا ہے

عزیز حامد مدنی

گل ذہن پہ رقصاں رقصاں
مسکراتی ہوئی اٹھلاتی تھی یوں رات ڈھلے
شادماں قافلۂ زیست رواں تھا لیکن
بڑھ کے قزاق حوادث نے سکوں کی مشعل
ہوش کے ہاتھ سے لی، گل کیا، شب خوں مارا
آن کی آن میں سب ہو گئے درہم برہم

آنکھ میں گرد ہے یادوں کی
دھواں چھایا ہے
ہاتھ میں دامن حسرت ہے
دریدہ دہ بھی
وقت کے موڑ پہ ہے جسم اسیر ظلمت
آرزوئیں نہ امیدیں نہ تمنا کوئی
ہوش ہے راہ گزر کا نہ پتہ منزل کا
دفن ہے قبر میں سینے کی جنازہ دل کا

التجا

اب نہ چہرے پہ اجالا
نہ گریباں میں سحر
آنکھیں خاموش
بتوں کی مانند
یاس بادل کی طرح چھائی ہوئی
راہیں گھبرائی ہوئی

ایک اک آنکھ نے پڑھ لی
وہ عبارت یارو
جو مرے چہرے پہ قسّامِ ازل نے لکھی
اس عبارت کا ہر اک لفظ بنا ہے کاسہ
میں سوالی نظر آنے لگا
سرتاپہ قدم

انسٹھ ا

آنکھیں خاموش
بتوں کی مانند
چاہتا ہوں کہ برس جائیں یہ آنکھیں
کھل کر
جسمِ تازہ ہو تو شاید ہو شگوفے کی نمو
جبر کی دھوپ میں بھی
ہنس پڑیں خوابوں کے کنول
میرے چہرے پہ جو لکھی ہے عبارت
اس کے
ایک اک لفظ کے چہرے پہ اجالا ہو
گریباں میں سحر!

التجا کرتا ہوں
اس قادرِ مطلق کے حضور
گنبدِ شب میں مہ و نجم سجائے جس نے
شہرِ دل میں نہ سہی چاند ستارے لیکن
اس کی دیواروں کے حصے میں دریچہ دیدے
لالہ و گل کی ضرورت نہیں اس گلشن کو
ہو سکے گر تو کوئی پھول سا چہرہ دیدے
جسم بخشے ہیں تمناؤں کو جب پتھر کے
دستِ امید میں ساغر نہ دے
تیشہ دے دے!!
علی قباس امید

ترسیل کا المیہ

دور آواز کے صحرا میں
کوئی لمحہ سرد
چھو کے احساس کے شانوں کو
بکھر جاتا ہے
اور پھر لفظوں کے رنگین حصار
قید کر لیتے ہیں معنی کو، سکوت
بکھرے لمحے کو سمیٹے ہوئے
صحرا سے پرے
چلتا جاتا ہے
یہاں تک کہ وہ کھو جاتا ہے
اور پھر لفظوں کے رنگین حصار
ہجر معنی میں بکھر جاتے ہیں خوابوں کی طرح

دور آواز کے صحرا میں
وہی لمحۂ سرد
چھو کے احساس کے شانوں کو
تلاطم کی طرح
لفظ و معنی کے سمندر میں چلا جاتا ہے
اور آواز کے صحرا میں
خیالوں کے طلسم
ناچتے پھرتے ہیں
بے جان بگولوں کی طرح

ورق ہے میرے صحیفہ کا آسماں کیا ہے
رہا یہ چاند تو شاید تمہارا چہرہ ہے

جسے بجاتا رہا تھا میں آبرد کی طرح
وہ لمحہ آج مری مٹھیوں سے پھسلا ہے

جو پوچھتا تھا مری عمر اس سے کہہ دینا
کسی کے پیار کے موسم کا ایک جھونکا ہے

فضا کی شاخ پہ لفظوں کے پھول کھلنے دو
جسے سکوت سمجھتے ہو زرد پتہ ہے

ابھی تو میرے گریباں میں ہے تیری خوشبو
ترے بدن پہ ابھی میرا نام لکھا ہے

لب گویا

مرے قدم بھی کوئی شام کاش لے لیتی
مرا سفر بھی تو سورج کی طرح تنہا ہے

ضرور چاند کے ہونٹوں پہ میرا نام آیا
مری مژہ سے ستارہ سا کوئی ٹوٹا ہے

سمٹ گیا تھا اندھیروں کو دیکھ کر لیکن
سحر کے ساتھ مرے راستے میں بکھرا ہے

ہر ایک شخص کو امید اب اسی سے ہے
تمام شہر میں وہ ایک ہی تو رسوا ہے

اپنے عہد کا مرثیہ

سفر نوشتہ ہے، منزل کہیں یہاں نہ وہاں
کوئی بتائے کہاں جائیں بے سر و ساماں

بہ طرزِ شامِ غریباں ہر ایک صبحِ طرب
اک ایک پل کے جگر میں چبھی ہے نوکِ سناں

بلا کا دشت کہیں یا کہ دشتِ کربِ و بلا
ہیں اپنی زیست کے صحرا میں موت کے مہماں

برہنہ پا ہے سلگتی ہوئی زمین پہ سوچ
کہاں پناہ لے کوئی نہیں ہے جائے اماں

سروں پہ دھوپ، زباں خشک، حلق میں کانٹے
جمی ہیں تجھ پہ نگاہیں امامِ تشنہ لباں

لمحہ لمحہ مجھ کو مارا ہے مگر زندہ ہوں میں
زندگی تیری قسم تجھ سے تو شرمندہ ہوں میں

میری آنکھوں میں ہے شیشہ اور پتھر ہاتھ میں
یہ صدی میری ہے اور اس کا نمائندہ ہوں میں

دھوپ میں سنولا گیا ہے ان کے چہرے کا گلاب
گونجتی آواز کا دعویٰ ہے تابندہ ہوں میں

اب زباں کو بھی نہیں کچھ یاد ہونٹوں کی طرح
اور لہو کا ذائقہ کہتا ہے پائندہ ہوں میں

نصب ہوگا خیمۂ شب دشت فردا میں امید
میں نوید صبح لاؤں گا کہ آئندہ ہوں میں

○

علی عباس امید

اور ایک کہانی

زرد رو دن ڈھلا
اور کرب کا سورج ڈوبا
پچھلی راتوں کی طرح زخم سی رات آئی ہے
پھر وہ بے نام سی اک فکر
حریفِ غمِ تنہائی ہے

نہ یہ حالات نئے ہیں نہ پگھلتے لمحات
پھر بھی
کیا جانے کہ کیا چاہتے ہیں گل سے فسردہ جذبات

جسم کے روپ میں آوارہ خیالوں کا ہجوم
دم بہ خود، زخم بہ جاں، حرف بہ لب
ذہن کے دروازے پر

طلب کمال کی کوئی نہ کیجیو زنہار
کہ میں یہ کرکے فضولی بہت زیاں دیکھا

قائم چاندپوری

سٹر بیٹھ

کانپتے ہاتھوں میں زنجیرِ معانی لے کر
چاہتا ہے کوئی دستک، کسی آواز کا پرکیف طلسم

سوچتی آنکھ کے گرداب میں خوابوں کی نمو
آس کا بادباں کھولے ہوئے ساحل کے تصور کے طفیل
آرزوِ زیست کی کرتی ہے مگر یاس کی لہر
ڈگمگا دیتی ہے، رہ رہ کے ڈبو دیتی ہے

اور وہ گل سے فسردہ جذبات
زخم سی رات کے شانے پہ چھلکتی ہوئی آنکھیں رکھ کر
اس کی بکھری ہوئی زلفوں کو بھگو دیتے ہیں
اپنی سسکی کو خموشی میں چبھو دیتے ہیں

لفظِ معدوم کے بکھرے ہوئے بے ربط حروف
اونگھتے گنبدِ ماحول میں
آواز کی طرح
گونج بن جاتے ہیں
خاموشی کو بکھراتے ہیں
بازگشت
دیر تلک سمت بہ سمت
بھاگتی پھرتی ہے..... آوارہ خیالوں کا ہجوم

علی عباس امید

چھوڑ کر معنی کی زنجیر، حریفِ غمِ تنہائی کو
کانپتے ہاتھوں پہ لیتا ہے کہیں اور چلا جاتا ہے

سوچتی آنکھ کے گرداب میں خوابوں کی نمو
مرگ اور زیست کی منزل سے گزر جاتی ہے
فکر بے نام کے جاتے ہی ٹھہر جاتی ہے

○

کبھی اک کہکشاں تخلیق کی تھی
اب اس پر پاؤں دھرتا جا رہا ہوں

لب گویا

گیان

میں کہ صبحِ ازل
جستجوئے بشر میں چلا تھا
آج تک رات دن صرف چلتا رہا

اب جو پہنچا ہوں اس دشت میں
تو یہ بوسیدہ قبروں کے مٹتے خطوط
مجھ سے کہتے ہیں
آگے

ان فصیلوں سے
کچھ ہی پرے
ایک بستی بھی آباد ہے

○

اکبر

یہی کہے گی مرے بعد گردشِ دوراں
گزر گیا وہ مرے نقش ابھارنے والا

امید پوچھئے ظلمت کے شکوہ سنجوں سے
ہے کوئی حسنِ سحر کو نکھارنے والا

○

عروسِ زیست کی زلفیں سنوارنے والا
چھپا کے منہ کو چلا سانس ہارنے والا

صلیبِ درد پہ ہر سانس گھٹنے والی ہے
کوئی نہیں رہا شاید اتارنے والا

سمجھ لو وقت کی رفتار قافلے والو
تمہیں پکار رہا ہے پکارنے والا

وہی زمین ہے تپتی ہوئی وہی شب ہے
بدل گیا ہے مگر شب گزارنے والا

لکیرِ ہاتھ کی بنتی بگڑتی رہتی ہے
جلاتا رہتا ہے ہم کو وہ مارنے والا

علی عباس امید

آرزوئیں جو کھلی تمہیں کبھی پھولوں کی طرح
وہ بھی اب ناچتی پھرتی ہیں بگولوں کی طرح

مدتوں وقت کی ناگن ہمیں ڈستی ہی رہی
ہم نے اک عمر بسر کی ہے رسولوں کی طرح

کچھ تو سیکھو اے نگارانِ تمدن ہم سے
ہم نے کانٹوں کو سجا رکھا ہے پھولوں کی طرح

سعی کر لو کہ مہک جائے اخوت کا چمن
غیر محکم ہے ہر اک سانس اصولوں کی طرح

قہقہے، امن، سکوں، پیار، محبت، خوشیاں
ہیں تو ذہنوں میں مگر صرف مقولوں کی طرح

لب گیا

تہنیت

خود قدم بوسی کو آ سکتی ہے منزل لیکن
شمع دل تیز رکھو اپنے اصولوں کی طرح

جب نظر ڈالتا ہوں صفحۂ ہستی پہ امید
مجھ کو سانپ نظر آتے ہیں ببولوں کی طرح

جب کبھی ترکِ غمِ دل کا سوال آتا ہے
ریت پر نام تھا میرا بھی خیال آتا ہے

موج طوفان اٹھی بہہ چلے خوابوں کے صدف
پھر برستے ہوئے بادل پہ زوال آتا ہے

اب مرے خواب کے ہمراہ وہی یادیں ہیں
جن کو معلوم نہ تھا شیشے میں بال آتا ہے

جب سمٹ آیا ہے خود جسم ہی پیشانی پر
کیوں در دل پہ دبے پاؤں ملال آتا ہے

کیا ترا ذہن بھی لمحوں کے سفر میں ہوگا
تیری بارات میں رہ رہ کے خیال آتا ہے

لب گویا

کچھ بہتر

کوئی ایسا بھی ہے جو نقش بہ دیوار نہ ہو
اب یہ تعمیر کی راہوں میں سوال آتا ہے

گھنٹیاں وقت کی بجتی ہیں مسلسل امید
فاصلے کہتے ہیں اک اور بھی سال آتا ہے

○

لمحوں کا حاصل

وہ ایک ساعت .....
وہ ایک ساعت عزیز تر ہے
وہ ایک ساعت عظیم تر ہے
وہ ایک ساعت جو وقت کے لازوال صحرا میں
ایک ذرہ سے کم بہت کم
وہ ایک ساعت جو وقت کے بیکراں سمندر میں
ایک قطرہ سے کم بہت کم
وہ ایک ساعت ـــــ جو کچھ نہیں ہے
وہ ایک ساعت ـــــ بہت گراں ہے
وہ بیکراں ہے

تمام لمحے
کہ جن میں گرمی ہے، رنگ و بو ہے

تقسیم

- ڈاکٹر راہی معصوم رضا، ۹
- ڈاکٹر وزیر آغا، ۱۸

حمد ۲۵
نوید صبح ستاروں کو جب ملا ہوگا ۲۶
اتنے افسردہ نہ ہو دیوار و در میں کچھ تو ہے ۲۸
روداد ۳۰
نکلا ہے تو پڑاؤ وہ ڈالے کہاں کہاں ۳۲
خالی لمحوں کی نظم ۳۴
افق سے تا بہ افق نور بن کے پھیلا ہوں ۳۶
قلم کا کرب ۳۸
تلاش ۴۱
طویل سوچ ہے اور مختصر لہو میرا ۴۲
کون کہہ سکتا ہے کھل جائیں گے کب ۴۴
ایک پرانا سوال ۴۶
آگہی کے ویرانے ۴۸
چاند اترا تھا مرے گھر میں تمنا بن کر ۵۰
پت جھڑ کی نظم ۵۲
کتنے ہی سناٹے یوں تو سرہ گزو ملے ۵۴
صلیب بر دوش ۵۶
التجا ۵۸
ترسیل کا المیہ ۶۰
ورق ہے میرے صحیفے کا آسماں لیا ہے ۶۲
اپنے عہد کا مرثیہ ۶۴
لمحہ لمحہ مجھ کو مارا ہے مگر زندہ ہوں میں ۶۵
اور ایک کہانی ۶۶
گیان ۶۹
عروس زیست کی زلفیں سنوارنے والا ۷۰
آرزوئیں جو کھلی تھیں کبھی پھولوں کی طرح ۷۲
جب کبھی ترک غم دل کا سوال آتا ہے ۷۴
لمحوں کا حاصل ۷۶

وہ ان کا حاصل ہے، جستجو ہے
اس ایک ساعت کے بدلے دے دوں
اک ایک پل میں شگفتگی کا
اک ایک پل اپنی زندگی کا
سنہری یادیں، رو پہلے سپنے
تمام لمحے کہ جو ہیں اپنے
اس ایک ساعت کی نذر کر دوں
کہ جس میں تم چونکتی، جھجکتی
خود اپنی سوچوں پہ مسکراتی،
بدن چراتی
حیا کے دامن میں منہ چھپائے،
نظر جھکائے
مرے قریب آئی ہو اور تمہاری خوشبو نے یہ کہا ہے
یہ دن ہے اپنا، یہ رات اپنی
حیات اور کائنات اپنی
طویل ہیں زندگی کی راہیں
طویل راہوں پہ صرف ہیں ہوں
طویل راہوں پہ صرف تم ہو

○

دور تک شوخ خوشبوؤں کے پہاڑ
پھر بھی جنگل ہے کچھ اجاڑ اجاڑ

ہوش کھو دیتی ہے ہر اک لمحہ
زندگی تیری خامشی کی دہاڑ

سوچتی رہتی ہیں یہ دیواریں
کیا کبھی دور ہوگی چھت کی آڑ

تیری صنعت کا شاہ کار ہے یہ
غنچۂ نو کو اس طرح تو نہ پھاڑ

دی ہے دستک حسیں خیالوں نے
گھر میں تنہائی کے پڑی ہے دراڑ

سو چکا چاند، تھک چکے تارے
پھر بھی بجتے ہیں میرے گھر کے کواڑ

لکھنے والے کو بھول کر لوگو
کیوں عبارت سے کر رہے ہو بگاڑ

کس طرح چاندنی کا بوسہ لے
شاخ کو جب ترس رہا ہے تاڑ

ہر خلا سے گزر کے تو امید
آسمان ادب پہ جھنڈا گاڑ

نروان

میں جب 'میں' تھا
تب
میری ناکامی ــــ ذاتی تھی
میری تنہائی ــــ میری تھی
میرے سب دکھ ــــ بس میرے تھے

لیکن
جب سے میں نے
درد کے پھیلے صحرا میں
غم کے بکھرے ذروں میں
'میں' کو کھو کر 'ہم' پایا ہے
تب سے یہ محسوس کیا ہے
دنیا کا غم میرا ہے اور
میں ساری دنیا کا ہوں ساری دنیا میری ہے

○

لب گویا

دھویں کے جسم پہ میں دھوپ چھوڑ کر جاؤں
کبھی تو شام کے ہمراہ اپنے گھر جاؤں

خزاں نے چھوڑ رکھا ہے تمہارے نام کا پھول
تمہیں بتاؤ کہ میں کس طرح بکھر جاؤں

سفرِ حیات کا دشوار تو بہت ہے مگر
نکل پڑا ہوں تو ہر موڑ سے گزر جاؤں

تری نظر سے گرا تو فقط یہ چاہ رہی
میں زندگی کی نگاہوں سے بھی اتر جاؤں

مرے سکوت میں وہ چیخ بن گیا امید
اسے گمان تھا شاید یوں ہی میں ڈر جاؤں

○

علی عباس امید

میں تو اک لمحۂ پریدہ رہا
جانے کیوں وہ بہت کشیدہ رہا

رو بہ رو ذکر نا شنیدہ رہا
اٹھ گیا تو مرا قصیدہ رہا

میں بھی بندہ ہی تھا خدا کی قسم
یہ الگ ہے کہ برگزیدہ رہا

اور تو کوئی غم نہ تھا اس کو
بس مری چاہ میں تپیدہ رہا

شب کی پیشانی کا میں جھومر تھا
کیا ہوا گر ہوا گزیدہ رہا

لب گویا

میرے حصے میں اس صحیفہ کا
اک ورق تھا وہی دریدہ رہا

کوئی امید بر نہ آتی تھی
زندگی بھر ستم رسیدہ رہا

○

اور اعتماد

وقت کے تلاطم میں آج میں اکیلا ہوں
زیست کے اندھیروں میں کچھ نقوش ابھرے ہیں

فکر و فن کی رفعت سے
رات کے اسیروں کو
جستجوئے صبح نو کے لئے صدا دی ہے
سیم و زر کی بستی سے
سنگ و خشت آئے ہیں
زندگی کے زخموں سے
اخذ نور کرنے پر
فصل گل کے خاروں نے
اور گل کھلائے ہیں
بجلیاں چمکتی ہیں غم کے آسمانوں پر

بدلیوں میں لفظوں کی
چاند گم ہے جذبے کا
دوستوں کی محفل سے
حسرتوں کے شانوں پر
سرنگوں ——————
میں لایا ہوں اعتماد کی میت
یاس کے اندھیروں میں
شمع عزم روشن ہے
پھر بھی ایک عالم ہے
جو کہ مجھ سے بدظن ہے

اپنوں نے، پرایوں نے
ذہن بیچ ڈالے ہیں
اور پھر نہ جانے کیوں
اوس چاٹ کر میں نے
بیکراں سمندر کے
خواب دیکھ ڈالے ہیں

انگنت خیالوں نے
مجھ کو گھیر رکھا ہے
وقت کا کرشمہ ہے

پھر بھی میں اکیلا ہوں

بڑھ رہے ہیں سائے پر
مجھ کو ہے یقیں اتنا
صبح نو کا ضامن ہے
میرے فن کا آئینہ

○

دور تک شوخ خوشبوؤں کے پہاڑ	۷۸	تعلقات کی گرمی نہ اعتبار کی دھوپ	۱۱۹
نروان	۸۰	ناطقہ سر بہ گریباں ہے نہ جانے کیا ہو	۱۲۱
دھوئیں کے جسم پہ میں دھوپ چھوڑ کر جاؤں	۸۱	ندی کا رجز	۱۲۳
میں تو اک لمحۂ پریدہ رہا	۸۲	فضا کے ساتھ چلے زندگی کے بدلے میں	۱۲۵
اور اعتماد	۸۴	دوستو ایک نئے عہد کی میں ہوں تمہید	۱۲۷
پھیر لیتے ہیں نظر دیکھ کے صدمات مجھے	۸۷	جہد رائیگاں	۱۲۹
دل کی آنکھوں میں تھا اک خواب گراں دیر ہوئی	۸۸	یوں تو ہر ایک لمحہ نیا حادثہ ہوا	۱۳۰
آگ کا دریا	۹۰	شب سیہ میں تمنا کے خواب لایا ہوں	۱۳۲
فروغ شمع کو شعلے سے احتساب تو ہو	۹۲	عام سا حادثہ	۱۳۴
مشورہ	۹۴	آئی ہے ایسی رات مگر کم بہت ہی کم	۱۳۶
بجھی بجھی ہیں فضائیں تو آبشار دھواں	۹۶	زخمی لمحہ	۱۳۸
دائروں کا دکھ	۹۸	سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اب کدھر دیکھیں	۱۴۰
پھر کوئی دست تہہ سنگ ہوا ہے شناید	۹۹	بستر علالت سے ایک نظم	۱۴۲
لہو کی آواز	۱۰۱	اس دور پر غبار میں کیسی ہوا چلی	۱۴۴
سانس لیتے ہوئے لفظوں میں سراپا لکھ دے	۱۰۳	میں جستجو میں رہوں اور پھر نہ پاؤں اسے	۱۴۶
رات تحریروں کی اب یکسر خالی ہو گئی	۱۰۵	سنگ سرد	۱۴۸
تاریخی لمحات	۱۰۷	روح کی بات سنے جسم کے تیور دیکھے	۱۵۰
اک شب رہ حیات میں شمعیں جلا کے دیکھ	۱۱۰	ایک پرانی نظم	۱۵۲
ہر ایک سمت اندھیرا ہے کچھ کرو لوگو	۱۱۲	ایک اور پرانی نظم	۱۵۴
تخلیقی سفر کے پچیسویں پڑاؤ کی نظم	۱۱۴	آج اس طرح اندھیروں کو سزا دی جائے	۱۵۶
رنگ بے رنگ ہوئے دید کے معیار گرے	۱۱۷	گیسوئے وقت کبھر جائے دو	۱۵۸

پھیر لیتے ہیں نظر دیکھ کے صدمات مجھے
اب کہاں جائیں گے لیکر مرے حالات مجھے

پہلے سورج تھا سوا نیزہ پہ لیکن اس بار
دینے والے نے عطا کی ہے سیہ رات مجھے

یاد کے پھول بھی مرجھا گئے دل کی مانند
اس کے جاتے ہی گئی چھوڑ کے ہر بات مجھے

آنکھ گر لگ بھی گئی ہے کبھی بھولے بھٹکے
سسکیاں بن کے جگانے لگے خدشات مجھے

دوستو! میں نے کہا تھا کہ تمہیں جیسا ہوں
پھر بھی پیالے میں ملے زہر کے قطرات مجھے

○

نظیر کے انتقال کے بعد مئی ۲۳، ۱۹۸۳ء

دل کی آنکھوں میں تھا اک خواب گراں دیر ہوئی
برف کے پھول سے اٹھا تھا دھواں دیر ہوئی

ایک اک لمحہ پہ صدیوں کا گماں ہوتا ہے
زندگی! کیسے بتائیں گے کہاں دیر ہوئی

ہمسفر دوریٔ منزل ہے ترے غم کی طرح
اڑ چکا راہ کا اک ایک نشاں دیر ہوئی

تیز تھی دھوپ تو بادل کی طرح پھیل گیا
پھر بھی مجھ سے یہ شکایت ہے وہاں دیر ہوئی

موم کی طرح پگھلتا ہے ابھی تک ماحول
اس طرف آیا تھا وہ دشمن جاں دیر ہوئی

نامرادی سے کہو آج ادھر سے گزرے
گڑھ لیا ریت پہ ہم نے بھی مکاں دیر ہوئی

لفظ معصوم ہیں ان سے نہ گلہ کر امید
ہم نے خود کاٹ لی اپنی ہی زباں دیر ہوئی

آگ کا دریا

روز و شب آئینۂ درد سجانے والے
نقشِ دیوار تھا
کیوں عارضِ دل پر تو نے
فکر و احساس کا غازہ مل کر
روبرو آئینہ رکھا ہے مرے

آنکھیں جل تھل ہیں مگر ان کے
دھندلکوں سے پرے
درد کی راکھ،
حوادث کی تپش،
نقشِ الم
زخم کی طرح لرزتے ہوئے آوارہ ہواؤں کے قدم
آرزوؤں کے شرارے ہیں

امیدوں کا دھواں
ہر خط و خال نظر آتا ہے جھلسا جھلسا

سوچتا ہے دلِ خوں گشتہ یہ بادیدۂ نم
آگ اور خون کو
دیکھا نہ تھا اس طرح بہم
کیا ہوا حادثہ،
صحرائے خط و خال میں
ابھرے کیوں کر
آگ اور خون کے
تپتے ہوئے یہ نقشِ قدم
وقت دریا سہی
پر آگ کا دریا تو نہیں

فروغِ شمع کو شعلے سے اجتناب تو ہو
اے میرے ذہن رسا بند تیر اباب تو ہو

جو آنے والا ہے اس عہد کا بھی حال لکھیں
ہمارے نام کسی پیل کا انتساب تو ہو

بھٹکتے ذہنوں کی یہ جستجوئے لاحاصل
بہت عظیم ہے پر داخل نصاب تو ہو

یہ ریزہ ریزہ اکائی سمٹ تو سکتی ہے
فقط یہ شرط ہے ریزوں میں پیچ و تاب تو ہو

بہت سے زندہ حقائق دلوں میں گھر کر لیں
مرے اداس فسانے کا اجتناب تو ہو

نہ کرب چہرے پہ ہو اور نہ آنکھ میں شکوے
خود اپنے نفس سے ہٹ کر کوئی عذاب تو ہو

قلم کے حسن میں پنہاں ہے رنگ قوس قزح
فضائے کہر کبھی اس سے فیضیاب تو ہو

یہ روز و شب کی صعوبت سزا سہی امید
ہے جس گنہ کی سزا اس کا ارتکاب تو ہو

مشورہ

ضربِ تنہائی کی
پھر تن پہ لگی
بہہ چلا خوابوں کا لہو

چاند کی دھند میں
کجلا گئے
یادوں کے چراغ

صرف ایک جسم ہے آنکھوں میں
سلگتا ہے دماغ

تشنگی بڑھ گئی، دل ڈھونڈتا ہے
ایسا سماں

چاندنی سرد ہو
چھلکے تری چاہت کا ایاغ

چاہتا ہوں کہ تجھے ڈھونڈنے نکلوں
لیکن
صفحۂ ذہن پہ
احساس نے لکھ ڈالا ہے
جستجو جسم کی بھی سخت ضروری ہے مگر
ابن آدم کی سلگتی ہوئی تاریکی میں
اپنی ہی ذات کا
پہلے تمہیں
پانا ہے سراغ

بجھی بجھی ہیں فضائیں تو آبشار دھواں
بھٹک رہا ہے سرِ جوئے کو ہسار دھواں

مجھے بدلتی ہوئی رت کا خوف کیوں کر ہو
کہ تیرا حسن ہے شعلہ تو میرا پیار دھواں

کسی طلب کا تقاضہ ہے یا کوئی خواہش
تری تلاش میں گزرا ہے بار بار دھواں

نکل پڑا مری رسوائیوں کی محفل سے
گلے لگائے ہوئے مجھ کو سوگوار دھواں

کسی کو چھوڑ دیا لاکے سبز باغوں میں
کسی کے ساتھ چلی بن کے رہگزار دھواں

لبِ گویا